تاریخ امریکہ

مصنفہ

فرینکلن ایشر

تاریخ امریکہ

مترجمہ

احسن صدیقی — احسن حامد

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

کتابت : حکیم ماشاءاللہ

طباعت : محبوب المطابع۔ دہلی

بار اوّل : اگست ۱۹۵۷ء

تعداد طباعت : پانچ ہزار

قیمت : دو روپے

Urdu translation of A Brief History of The United States by Franklin Escher, Jr. originally published by The New American Library of World Literature, Inc. New York, America. Translated and published with the permission of the author and publishers.

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

حصہ اوّل

تعارف

اس کتاب کا مقصد تاریخ امریکہ سے ان لوگوں کو روشناس کرانا ہے جو اس ملک کی تاریخ کو تقریباً فراموش کر چکے ہیں۔ نیز یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بھی شمع راہ کا کام دے گی جو اس ملک کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں اور اگر کچھ واقفیت رکھتے بھی ہیں تو صرف سرسری۔ زیرِ نظر کتاب میں زیادہ توجہ ان مسائل اور واقعات کی طرف کی گئی ہے جن کی قدرتی، اخلاقی اور اقتصادی قدروں نے اس ملک کو ایک منفرد اور امتیازی شان بخشی۔

تھوڑی دیر کے لئے اس بات پر بھی غور کیجئے کہ آخر یہ لوگ کیوں پہلے پہل امریکہ کے شمالی ویران علاقوں میں آکر آباد ہوئے۔ یہ دراصل قدیم دنیا کے قوانین اور رواجوں سے بیزاری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے لئے ایک الگ سماج کی بنیاد ڈالی۔ ان ابتدائی باشندوں کو آزادی اتنی عزیز تھی کہ یہ خود اپنوں تک کی محکومی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں مغرب کی جانب بڑھتے گئے تاکہ وہاں اپنے لئے نئے قوانین اور نیا طریقِ زندگی

وضع کر سکیں لیکن اس خودسری کے جذبے نے ان کی آبادیوں کے اتحاد کو فنا
کردیا۔ جب انگریزوں نے ان کی آزادی کو چیلنج کیا تو اس وقت انھوں نے
صحیح معنوں میں متحد ہونا سیکھا اور نہ صرف متحد ہونا سیکھا بلکہ آزادی حاصل
کی اور دستور کی رہنمائی میں یہ قوم آگے بڑھی۔

امریکہ کی تاریخ کا تانا بانا بہت سے رشتوں سے مل کر بنتا ہے۔ ان
میں غلامی، صنعتی سرمایہ داری کا عُروج اور جذبۂ اصلاح و اختلاف خصوصیت
سے اس کی بیداری اور قومی نشو و نما میں دخیل ہیں۔ بلکہ یہی اسباب ہیں
جن کی وجہ سے امریکہ آج دنیا کا رہنما ہے۔ مذکورہ بالا رشتے بطور خود
بڑے رنگا رنگ ہیں اور ایک ڈرامائی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی سب مل کر امریکہ
کی کہانی کو بڑی کامیابی سے مرتب کرتے ہیں۔

مصنف کو اُمید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے ناظرین نہ صرف محظوظ
ہوں گے بلکہ اس سے فائدہ بھی اُٹھائیں گے۔

پہلا باب

دریافت اور ابتدائی بسنے والے

براعظم شمالی امریکہ کے ابتدائی دور کی تاریخ پر ایک پُراسرار پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہاں کے اصلی باشندے جنھیں ہندوستانی کہتے ہیں شمالی ایشیا سے ہجرت کر کے جزائر الاسکا میں آباد ہوئے تھے اور وہاں سے کچھ زیادہ گرم علاقوں کی طرف بڑھے۔ ان امریکی ہندوستانیوں کے قدرتی خدوخال، ان کے کالے بال، تانبے جیسی رنگت اور گالوں کی ہڈیوں کے اُبھار، ان کے مشرقی النسل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس یقین کو سائینسدانوں کا خیال اور بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تقریباً بیس ہزار برس پہلے یعنی آخری برفانی دور میں ایشیا، شمالی امریکہ سے آبنائے بیرنگ (Bering Strait) پر ملتا تھا۔ شاید امریکی ساحلوں پر سب سے پہلے اُترنے والوں میں سکنڈے نیویا کے باشندے ہیں جو اپنے گول اور یک مستولی جہازوں سے ۹۸۵ء میں بحرِ منجمد شمالی سے گذر کر گرین لینڈ پہنچے۔ اس وسیع جزیرے

سے ان کے جہاز اور آگے بڑھے اور ایسی شہادت موجود ہے کہ تقریباً ۱۰۰۰ء میں الیف ایرکسن وغیرہ نے اس زمین پر قدم رکھا جسے اب ریاستہائے متحدہ کہتے ہیں۔ وہ چاہے کتنے ہی قابل ہوں مگر اس نئی دنیا میں وہ اپنے کچھ بھی نشانات نہ چھوڑ سکے اور نہ انھوں نے اپنے حالاتِ سفر کو کسی دستاویزی اور مستند شکل میں ترتیب دیا۔ ان کے بعد تقریباً ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس یہاں آیا۔ اُس نے نہ صرف یہاں کے حالات دیکھے اور اپنے تاثرات قلمبند کئے بلکہ ویسٹ انڈیز میں بساؤ کی کوششوں میں امداد بھی دی۔ اس لئے امریکہ کی دریافت کا سہرا در اصل اسی کے سر ہے۔ کولمبس خود اطالوی تھا مگر اسپین کے بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا کا ملازم تھا۔

امریکہ کی دریافت بالکل اتفاقی امر تھا (اور جو ملک اس کی دریافت کا سبب بنا وہ ترکی تھا) پندرھویں صدی کی یہ اُبھرتی ہوئی وسیع سلطنت مغربی یورپ اور ایشیا کی اس تجارت میں حائل ہو رہی تھی جو مارکوپولو کے زمانے میں شروع ہوئی۔ مغربی یورپ کے ممالک نے زمانۂ جاہلیت سے بیدار ہوکر ایشیا پہنچنے کے لئے ترکی کی طاقت کے خوف سے دوسرا راستہ تلاش کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر واقعی دنیا گول ہے جیسا کہ بہت سے جغرافیہ داں مانتے ہیں تو بھلا یہ کیونکر ممکن نہ ہوگا کہ اگر اسپین سے مغرب کی طرف چلتے رہیں تو جو زمین آئے وہ ایشیا کی نہ ہو۔ لیکن نہ بیچارے کولمبس کو یہ معلوم تھا اور نہ اس کے ہمعصر جانتے تھے کہ ایشیا جانے کے راستے میں مغرب کی طرف شمالی اور جنوبی امریکہ حائل ہوں گے۔ چنانچہ کولمبس اور

دوسرے بہادر سیاح جو اس کے بعد آئے باہما، پاناما اور جنوبی امریکہ کے ساحلوں سے ٹکرائے اور یہ سمجھے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ کولمبس زیادہ نہ جی سکا ورنہ خود دیکھ لیتا کہ وہ ایسٹ انڈیز کے بجائے ویسٹ انڈیز پہنچ گیا ہے۔ لُطف یہ کہ اس غلطی کا احساس ۱۵۱۹ء سے ۱۵۲۲ء تک کسی کو نہ ہو سکا اور اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب اسپین کے ایک باشندے ایف میگالین نے اس بات کا بیڑا اُٹھایا اور وہ جنوبی امریکہ کی راس سے ہوکر ناقابل عبور بحرالکاہل کو چیرتا ہوا ایشیا پہنچ گیا۔ اگرچہ میگالین فلپائن میں وہاں کے باشندوں کے ہاتھوں مارا گیا لیکن اس کے ساتھیوں نے سفر جاری رکھا اور وہ افریقہ کا چکّر کاٹتے ہوئے اسپین واپس پہنچ گئے اور اس طرح اُنھوں نے نہ صرف دنیا کا گول ہونا ثابت کر دیا بلکہ اس وقت کے جغرافیہ دانوں کے مفروضے کے خلاف یہ بھی ثابت کر دیا کہ دنیا اُس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جتنی وہ فرض کئے بیٹھے ہیں۔

امریکہ کا نام امریگو ویسپاسی کے نام پر رکھا گیا۔ یہ شخص اٹلی کا رہنے والا تھا اور اس نے ۱۵۰۱ء میں برازیل کے ساحل پر سیاحت کی اور واپس یورپ پہنچ کر اپنے سفر کے اس قدر تفصیلی حالات لکھے کہ اس کی شہرت نے کولمبس کو بھی مات کر دیا۔ جب نقشہ بنانے والوں نے نقشے پر اس نئی دنیا کا نام لکھنا چاہا تو اس عزت کے لائق ویسپاسی ہی منتخب ہوا۔ کولمبس کے عظیم کارناموں کے پیش نظر یہ بھلا تاریخی مسخرہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔

فتوحات کے ابتدائی سالوں میں اسپین دوسری قوموں پر سبقت لے گیا ہیرنانڈو کورٹز نے ایک مسلح جماعت لے کر میکسیکو پر چڑھائی کردی اور وہاں کے مہذب باشندوں کو ۱۵۲۱ء میں اسپین کی نوآبادی قرار دیدیا۔ اسی طرح فرانسسکو پیزارو نے ۱۵۳۳ء میں پیرو کی سلطنت پر حملہ بول دیا اور اس طرح اپنے بادشاہ کے لئے سونے اور چاندی کی کانوں کے منہ کھول دیئے۔

جب اسپینی امریکہ کے قطبی علاقوں اور سرسبز جنگلوں میں گھس رہے تھے تو ان میں سے کچھ اس شمالی حصہ کی طرف بھی گھومتے پھرتے آ نکلے جو اب ریاستہائے متحدہ امریکہ کہلاتا ہے۔ پونس ڈی لین ۱۵۲۱ء میں فلورڈا پر چشمہ سدابہار[1] کی تلاش میں اترا جس کے متعلق ہندوستانیوں میں کہانیاں مشہور تھیں۔ ٹامپا کے مقام پر اس نے ایک بستی بسانے کی بھی ناکام کوشش کی۔ اس طرح بیزاڈوا کا جس کا جہاز خلیج میکسیکو کے قریب تباہ ہوگیا، ٹیکساس سے گذر کر کیلیفورنیا پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے معتقد ہندوستانی بھی تھے جو اسے دیوتا سمجھتے تھے غرضیکہ اسپین کے بنے ٹھنے دستے کیل کانٹے سے لیس جنگلوں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے اور توپوں اور بندوقوں کے سائے میں اپنا اثاثہ زندگی لئے سرگرداں تھے، جو اس سے پہلے اس

---

[1] کہتے ہیں کہ اس چشمے سے جو بھی پانی پی لے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ غالباً یہ تصور آب حیات ہی کے تصور سے مشتق ہے۔ مترجم

نئی دنیا میں کبھی نظر نہ آتے تھے۔

دریائے مسسی پی شمالی امریکہ کے درمیان گذرتا ہے۔ اس دریا کو ہیرنانڈو ڈی سوٹو نے ۱۵۴۱ء میں معلوم کیا اور یہی دریا اس کا مدفن بھی ہے ہوا یہ کہ دوران سفر میں اسے بخار آیا اور وہ بچ نہ سکا۔ چنانچہ اس کے ساتھیوں نے اس کی موت کو دشمن ہندوستانیوں سے چھپانے کے لئے اس کی لاش کو دریا برد کر دیا۔ ایک نام کورونا ڈو کا بھی قابلِ ذکر ہے جس نے سونے کی تلاش میں وہ علاقہ چھان ڈالا جسے اب کنیاس کہتے ہیں۔

اس علاقے میں جو بعد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کہلایا سب سے پہلی مستقل آبادی سینٹ آگسٹائن (فلورڈا) کے مقام پر ۱۵۶۵ء میں آباد ہوئی اور ہسپانیوں نے یہاں ہندوستانیوں کی لوٹ مار اور بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لئے ایک عظیم الشان قلعہ بھی بنوایا تھا کیونکہ فرانس انگلینڈ، ہالینڈ، سویڈن اور پرتگال وغیرہ کو اس نئی دنیا سے گہری دلچسپی پیدا ہوتی جا رہی تھی اس لئے ان ممالک کے جہاز اکثر امریکہ کے ساحلوں اور بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے اور اس سرزمین کی بادہ پیمائی کرتے نظر آتے تھے۔ ایک انگریز جہاز کا اطالوی کپتان جس کا نام جان کیبٹ تھا ۱۴۹۷ء میں بحر اوقیانوس کو پار کرتا ہوا نہایت ہوشیاری سے لیبراڈر اور نیوفاؤنڈلینڈ تک جا پہنچا تھا۔ اسی کے اس سفر کی بنا پر انگلستان براعظم شمالی امریکہ پر اپنا حق جتانے لگا۔ اس کے بعد فرانسیسی جھنڈے کے سائے میں ویرازانو بڑھا اور ۱۵۲۴ء میں شمالی اوقیانوس کے ساحلوں پر سیاحت کرتا ہوا کرولیناس اور نیوفاؤنڈلینڈ تک جا پہنچا۔

پھر ایک اور فرانسیسی جیکس کارٹیر ۱۵۳۵ء میں دریائے سینٹ لارنس سے ہوتا ہوا موجودہ مونٹرال (کینیڈا) تک آیا۔

اسی عرصہ میں یورپ میں کچھ اس قسم کی آوازیں اُٹھنے لگیں کہ نئی دنیا کو تقسیم کرکے اپنی اپنی سلطنت کا علاقہ بانٹ لیا جائے۔ دراصل انگلستان کو یہ سخت ناگوار تھا کہ اسپین کے جہاز امریکہ سے سونا لاد لاد کر لئے جاتیں اس حسد کی بنا پر انگریز ہسپانیوں کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگے یہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ انگلستان اصلاحات کے بعد عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ کی طرف جھک گیا اور دوسری طرف اسپین کیتھولک فرقے کا نمایاں علمبردار بن گیا۔

سولھویں صدی کے اواخر میں ملکہ الزبتھ کے دور میں انگریز "بحری قزاقوں" نے ہسپانوی جہازوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے اور کپتان ہاکنس، کیونڈش، اور بے مثال سرفرانسس ڈریک جیسے نڈر جہازراں ہسپانوی تاجروں کا سونا چھین لینے کے لئے ان کو ڈھونڈتے پھرتے تھے وہ قزاق اور لٹیرے تھے مگر اس کے باوجود ان کو ملکہ الزبتھ کی سرپرستی حاصل تھی۔

اسپین کا بادشاہ فلپ ان حملوں کی وجہ سے بھرا بیٹھا تھا اور آخرکار ۱۵۸۸ء میں اُس نے فیصلہ کر ہی لیا کہ ایک طاقتور بحری بیڑے کے ساتھ انگلستان پر چڑھائی کردی جائے تاکہ ان حملوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے لیکن فلپ کے بحری بیڑے کو بہادر انگریز جہازرانوں نے رودبار

انگلستان میں ہی منتشر کر دیا اور اس کے بعد ایک زبردست سمندری طوفان نے اس منتشر بحری بیڑے کے جہازوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اس شکست سے اسپین کی بحری طاقت ٹوٹ گئی اور وہ اس قابل نہ رہ سکا کہ شمالی امریکہ کے ساحلوں کے بارے میں جہاں آبادیوں کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی انگلستان سے ٹکر لے سکے۔

انگلستان نے اب ۱۵۷۸ء میں کھل کر اپنی سلطنت کی آبادیاں قائم کیں اور ملکہ الزبتھ نے ہمفری گلبرٹ جیسے آزمودہ کاروں کو پروانہ لکھدیا کہ "جو علاقے عیسائیوں کے قبضے میں نہیں ہیں ان پر قبضہ کرکے آباد کر لیا جائے"۔ چنانچہ گلبرٹ اپنے ساتھیوں کو لے کر نیوفاؤنڈلینڈ پہنچا لیکن موسم نے اس کا ساتھ نہ دیا اور سخت سردی کی وجہ سے ناکام واپس لوٹتے ہوئے راستے ہی میں وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔

اس کے چھ سال بعد ملکہ الزبتھ نے شمال میں دریائے لارنس اور جنوب میں فلورڈا کے درمیانی علاقہ کو انگریز آبادی قرار دے کر اس کا نام ورجینیا رکھا۔ اس طرح شمالی اوقیانوس کے تقریباً تمام ساحل محصور کر لئے۔ ملکہ نے اپنے ایک موقر درباری سر والٹر ریلے کو یہ ذمہ داری سونپی کہ اس علاقے میں بستیاں بسائے۔ شمالی کیرولینا کے جزیرے رونوک میں ۱۵۸۵ء سے ۱۵۸۷ء تک کئی جماعتیں اس مقصد سے آئیں پہلی تو وہاں کے ہندوستانیوں کے حملوں کی تاب نہ لاکر اور اس جگہ کو ناقابلِ رہائش سمجھ کر واپس لوٹ آئی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان

کو ضروری سامانِ رسد بھی نہ پہنچ سکا۔ آخری جماعت کا حشر پردۂ راز میں ہے، غالباً وہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اس جماعت کے لوگ بمعہ اس پہلے بچے "ورجینیا ڈیر" کے جو انگریز ماں باپ سے امریکہ کی سرزمین پر پیدا ہوا ایسے غائب ہوئے کہ ان کے متعلق پھر کسی نے کچھ نہیں سُنا۔ لیکن اسپین کے بحری بیڑے کو شکست دینے کی وجہ سے انگریزوں کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے تھے اور انھیں اپنی زبردست طاقت اور ملکہ الزبتھ کی سرپرستی پر اتنا ناز تھا کہ یہ ناکامیاں بھی ان کے حوصلے پست نہ کرسکیں۔ اس نئی اُمنگ کی جھلک اس قوم کے بدلتے ہوئے ڈھانچے میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ پروٹسٹنٹ اور پیورٹن فرقوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سرکاری مذہب سے ہٹ کر اپنا طریق عبادت بھی الگ وضع کرنا چاہتے تھے۔ اس اُمنگ کے تاثرات ان درمیانی درجے کے تاجروں میں بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے اتنی دولت پیدا کی کہ جو نہ صرف ان کے اپنے لئے کافی تھی بلکہ سمندرپار کی تجارتوں میں بھی لگائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ان انگریز تاجروں نے امریکہ کی آبادی کو فروغ دینے کے لئے تجارتی ادارے قائم کئے۔ لوگوں کو انگلستان چھوڑنے کے لئے رضامند کرنے میں انھیں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ ملک اقتصادی اصلاحات کے دَور سے گذر رہا تھا اور بے کار مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ بہت سی قدیم زمینداریوں کی تنسیخ کی وجہ سے کسان بے کار ہوگئے تھے۔

ایسے لوگوں کو نئی دنیا میں زندگی ازسرنو شروع کرنے کے لئے بڑے مواقع فراہم تھے۔ پھران میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ملک کے مذہبی حالات سے نالاں تھے اور شمالی امریکہ کے پُرسکون جنگلوں میں عبادت کی آزادی کو جنّت کے برابر سمجھتے تھے۔

سنہ ۱۶۰۶ء میں بادشاہ جیمس اوّل نے لندن کمپنی اور پلائی متھ کمپنی کے نام اجازت نامے جاری کردیئے کہ وہ کچھ خاص علاقوں میں بستیاں بسائیں اوران سے تجارت کریں۔ لندن کمپنی کو وہ علاقہ دیاگیا جو ۳۴ سے ۴۱ عرض بلد تک پھیلا ہوا ہے یعنی موجودہ شہر نیویارک سے شمالی کرولینا کے کیپ فیرتک اور پلائی متھ کمپنی کو ۳۸ سے ۴۵ عرض بلد تک علاقہ سونپا گیا جو نیو انگلینڈ اور ریاست نیویارک دریائے پٹومک کے جنوب تک چلا گیا ہے۔ ۳۸ سے ۴۱ عرض بلد تک کے درمیانی علاقے میں دونوں کمپنیوں کو بستیاں بسانے کا اختیار دے دیا گیا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ ہر آبادی ایک دوسرے سے کم ازکم سو میل کے فاصلے پر ہو۔ تاکہ آپس کے علاقائی جھگڑوں کی روک تھام ہو سکے۔

ہسپانوی اگرچہ سارے شمالی امریکہ کی ملکیت کے دعوے دار تھے۔ لیکن ان کے اعتراضات سے بے پروا ہو کر سنہ ۱۶۰۷ء میں لندن کمپنی نے کپتان کرسٹوفر نیوپورٹ کی نگرانی میں تین جہاز خلیج چیساپیک (ورجینیا) کے لئے روانہ کئے۔ دریائے جیمس سے اوپر پہنچ کر

تقریباً ایک سو بیس آدمی ایک جزیرہ نما میں اترے اور مناسب مذہبی رسومات کے ساتھ اس کا نام اپنے بادشاہ کے اعزاز میں جیمس ٹاؤن رکھا۔ یہ مئی ۱۶۰۷ء کا ذکر ہے اور یہ آبادی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پہلی مستقل انگریز آبادی تھی۔ در اصل یہاں سے تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس دور اُفتادہ چھوٹی سی آبادی کو ابتداء ہی سے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو ہندوستانی ہی ستانے کے لئے کچھ کم نہ تھے اس پر آس پاس دلدلوں کی وجہ سے ملیریا بھی پھوٹ پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے بسنے والوں کو خاصا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ خود نوآباد باشندے بھی بجائے کھیتی باڑی کرنے اور گھر بنانے کے سونے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے اور دریاؤں کے ذریعہ ایشیا پہنچنے کا روایتی راستہ تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے تھے۔ غرضیکہ تقریباً تین چوتھائی آبادی پہلی ہی ششماہی میں لقمۂ اجل بن گئی۔

اس موقعہ پر کپتان جان سمتھ نے جو نہ صرف ایک نڈر سپاہی تھے بلکہ جغرافیہ دال اور مصنف بھی تھے، اس ڈوبتی نیّا کو سہارا دیا اور اس آڑے وقت میں بستی کو سنبھالا۔ بھوک سے تڑپتی ہوئی بستی کو ہندوستانیوں سے کسی نہ کسی طرح غلّہ دلوایا۔ کمزور شکستہ دل انسانوں کو ڈھارس دی اور جینے کے لئے مزید کوشش کرنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلہ میں جان رولف بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ اس نے تمباکو کے

تجارتی امکانات کو روشن کیا کیونکہ تمباکو کی انگلستان میں ہمیشہ ہی ضرورت رہتی ہے اور اس طرح اس نے بستی کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بڑی مدد دی۔ ایک ہندوستانی سردار کی لڑکی سے رولف کی شادی ہو جانے کی وجہ سے جانبین میں کئی سالوں تک صلح رہی۔ محبت کی یہ داستان دنیا کی عظیم رومانی داستانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ ہندوستانی رئیس زادی اسی کے ساتھ لندن بھی آئی اور شاہی دربار کی آنکھ کا تارا بن کر رہی اور اپنے ملک سے بہت دور لندن ہی میں سپرد خاک ہوئی۔

جب جیمس ٹاؤن کے بسنے والوں نے اپنی بقاء کے لئے اپنے لئے مکانوں اور قلعوں کی تعمیر کی طرف توجہ دی تو کام کرنے کے لئے مزید آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۶۱۹ء میں حبشی غلاموں کا ایک دستہ یہاں لایا گیا اور یوں اس قضیئے کی بنیاد پڑی جس نے آگے چل کر امریکہ کو صدیوں کے لئے اندرونی جھگڑوں میں الجھا دیا اور در اصل یہ مسئلہ کچھ اس طرح اُلجھ کر رہ گیا کہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں امریکی اس پر قابو پانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔

جمہوری طرزِ حکومت نے جیمس ٹاؤن کی بستی میں اسی سال جنم لیا جس سال غلام وہاں پہنچے۔ بادشاہ جیمس نے نوآباد باشندوں کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ہر بستی سے دو نمایندوں کا تقرر کر لیں جو جیمس ٹاؤن

کے گورنر سے شہر کے چھوٹے سے گرجا گھر میں مل لیا کریں۔ چنانچہ ستائیس نمایندوں کی مجلس قائم ہوئی جس کا پہلا سشن کئی قانون پاس کر کے ۴ر اگست ۱۶۱۹ء کو ختم ہوا۔ بادشاہ جیمس کو بعد میں اس پر افسوس ہوا کہ لوگوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے کا اختیار کیوں دیا گیا اور اس نے اس نمائندہ مجلس کو دبانے کی کوشش بھی کی لیکن موت نے مہلت نہ دی کہ وہ اپنے اس "نیک قدم" کو بدل سکتا۔ اور اس طرح آزادی کی یہ چنگاری روز بروز روشن ہوتی رہی۔

۱۶۲۵ء تک ورجینیا کی آبادی تقریبًا ایک ہزار نو آباد نفوس تک پہنچ گئی۔ رسد پہنچتی رہی اور آبادی بڑھتی رہی۔ ۱۶۲۲ء میں ہندوستانیوں نے طے کیا کہ اچانک حملہ کر کے ان پردیسیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں لیکن ان کے ساتھیوں میں سے چانکو نے انگریزوں کو اس ارادے سے باخبر کر دیا۔ چانکو اگرچہ ہندوستانیوں ہی میں سے تھا لیکن عیسائی ہو گیا تھا۔ اس طرح تباہی کا یہ خطرہ ٹل گیا۔ اس کے بعد نو آباد باشندوں نے پڑوسی قبیلوں کو کبھی سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔

اسی دوران میں شمالی علاقے میں کئی اہم واقعات رونما ہو رہے تھے۔ پلائی متھ کمپنی نے مین کے مقام پر ایک بستی بسائی لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ ایک انگریز جہاز راں ہنری ہڈسن جو ہالینڈ کا ملازم تھا دریائے ہڈسن پر آپہنچا اور اس نے اس دریا پر ہالینڈ کی ملکیت جمانی چاہی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی قوموں کے جہاز نیو انگلینڈ کے ساحل

پر ماہی گیری، تجارت اور سیاحت کی غرض سے بھٹکتے رہے۔ غرضیکہ میسیچوسیٹس کا یہ علاقہ بہت مشہور ہوگیا۔ ان ساحلوں پر سنہ ۱۶۲۰ء میں ایک چھوٹا سا جہاز "مئی فلاور" نام کا آیا۔ اس میں سو مرد اور عورتیں سوار تھیں جن کو تاریخ میں "زائرین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی کہانی عام طور پر مشہور ہے اور امریکہ کی قومی تعطیل "اظہار تشکر" شکرانے کی اس تقریب کی یاد دلاتی ہے جو ان لوگوں نے امریکہ کے ویرانوں میں ایک سال بخیریت گذارنے پر منائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اتفاقاً ادھر آ گئے تھے۔ ان کا اصل ارادہ جیمس ٹاؤن کے قریب ہی آباد ہونے کا تھا۔ لیکن سمندر کے طوفان یا شاید بعد میں خود ان کے ارادوں میں تبدیلی انھیں شمال کی طرف لے آئی۔ یہ لوگ کیپ کاڈ میں نومبر کے مہینے میں اُترے جب کہ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بہادروں کا یہ گروہ بغیر کسی اجازت کے ساحل پر اُترا۔ اور اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا نام "متحدہ مئی فلاور" رکھا گیا۔ اور اس طرح پلائی متھ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہوگیا۔ قطع نظر ان تمام مشکلات کے جو وہ اب تک برداشت کر چکے تھے حقیقی تکالیف بسنے کے بعد شروع ہوئیں۔ اس جماعت میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ کچھ تو مذہب کے مارے ہوئے تھے جن کو بارہ برس پیشتر انگلستان بدر کر کے ہالینڈ بھیج دیا گیا تھا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انھوں نے کیتھولک فرقے کے ان رہے سہے نشانات کے خلاف احتجاج

کیا تھا جو ایک پروٹسٹنٹ گرجا میں پائے جاتے تھے حالانکہ اس گرجا کی سرپرستی خود حکومت ہی کرتی تھی۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ اُونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور کچھ عالم تھے جن میں کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ولیم بریڈفورڈ اور ولیم بریوسٹر بھی شامل تھے۔

ہالینڈ سے نئی دنیا کو ہجرت کرنے کے لئے ان لوگوں نے انگلستان کے کچھ تاجروں کو اس مقصد کے لئے مالی امداد دینے پر راضی کرلیا تھا اور اس کے بدلے یہ وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ مال یہ امریکہ سے بھیجیں گے اس میں ان تاجروں کا بڑا حصّہ ہوگا۔ اس کے بعد لندن اور دوسرے شہروں سے باقی مسافروں کا بندوبست کیا۔ ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو نئی دنیا میں بہتر مواقع حاصل کرنے کے متمنّی نہ ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں کو بغیر کسی خاص دقت کے ایسے لوگ مل گئے۔ ان میں جان ایلڈن ٹائپ کے لوگ بھی شامل تھے۔ جان ایلڈن معمولی شراب فروش تھا اور اس کے پاس کرائے وغیرہ کے اخراجات تک نہ تھے چنانچہ وہ کرائے کے عیوض چند سال کے لئے جہاز کے مسافروں کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

یہ صرف جمہوریت نوازی اور امریکی طرزِ عمل کی برکت تھی کہ اتنی مختلف حیثیتوں اور شخصیتوں کے لوگ کسی مقصد کے لئے اس طرح متحد ہو گئے، نسلی امتیاز اُٹھ گئے اور عالم و جاہل کے تصوّر کو یکسر بھلا دیا گیا اور بجائے خاندانی وجاہت کے آدمی کی قدر اس کی ذاتی

لیاقت کی بنا پر کی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ چیز ان جنگلوں میں کام بھی آئی جہاں ہر وقت ہندوستانیوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ جہاں خوراک کی خوفناک قلت تھی۔ اور جہاں موت ہر وقت شکاری کا شکار کرنے کی تاک میں لگی رہتی تھی۔

پہلی ہی کڑاکے کی سردی میں آدھے سے زیادہ لوگ سردی کی تاب نہ لاکر مر گئے لیکن جب بہار کا موسم شروع ہوا تو کچھ ہندوستانی دوستوں نے انھیں کاشت کرنا اور قدرتی حالات سے مقابلہ کرنا سکھایا اور جب دھوپ میں ذرا گرمی آئی تو ان "زائرین" کی کچھ جان میں جان آئی۔ ہمّت بندھی اور حوصلے بڑھے۔

میسیچوسٹس کے ساحل پر یہ مٹھی بھر انسان روز بروز طاقت پکڑتے رہے۔ ادھر انگلستان میں مذہبی جھگڑے پھر سے تازہ ہو گئے اور پچھلے ملک بدر لوگوں کی طرح پیورٹن فرقے کے لوگوں نے پھر گرجاؤں میں پاپائیت کے اقتدار پر سخت احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ اس پر حکومت نے انھیں تنبیہ کی کہ یا تو وہ قومی مذہب کی پیروی کریں ورنہ ملک چھوڑ دیں۔ ساتھ ہی آرچ بشپ لاڈ نے بھی ان بیچاروں کو خوب تنگ کرکے نکلوا کر ہی دم لیا۔ مجبور و بے کس ہو کر آخر ان لوگوں نے بادشاہ سے شمالی اوقیانوس کے ساحل پر آباد ہونے کی اجازت لی اور اچھی خاصی تعداد میں وہاں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے علاوہ شاہ چارلس اوّل نے خلیج میسیچوسٹس کی کمپنی کو بھی ہدایت کردی

کہ پیورٹن فرقے کے لوگوں کو بوسٹن کے گرد و نواح میں آباد کیا جائے جہاں یہ لوگ انگریزی قانون کے ماتحت رہ کر اپنی حکومت خود بنائیں گے۔ اس طرح ۱۶۲۸ء میں وہاں سب سے پہلی جماعت پہنچی۔ اس جماعت کا رہنما جان اینڈی کاٹ تھا۔ اس کے دو سال بعد جان ونتھراپ مزید دو ہزار اشخاص پر مشتمل ایک اور جماعت لے کر پہنچ گیا۔ یہ شخص بعد میں وہاں کا گورنر بھی مقرر ہوگیا۔

اس طرح نچلے ساحلوں پر بھی لوگ برابر آتے رہے اور میری لینڈ میں آباد ہوتے رہے۔ مگر یہ لوگ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے پروٹسٹنٹ پڑوسیوں کے تنگ کرنے پر یہاں آئے تھے۔ اس وقت یعنی ۱۶۳۴ء میں ان کا رہنما لارڈ بالٹیمور تھا۔ اسی طرح کچھ پھیری لگانے والوں کو لے کر ولیم پین ۱۶۸۲ء میں پنسلوانیا میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ ان تمام بستیوں کے رہنے والے آہستہ آہستہ آس پاس کے علاقوں میں پھیلتے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۰۰ء تک اوقیانوس کے ساحل پر میسیچوسیٹس سے لے کر کرولیناس تک انگریزوں کی گنجان آبادی ہوگئی۔

ہالینڈ والے بھی غافل نہ تھے انھوں نے بھی ہنری ہڈسن کے اعلانِ ملکیت کو عملی جامہ پہنایا اور نیو ایمسٹرڈم کے نام سے ایک بستی آباد کی جس کو اب نیویارک کہتے ہیں۔ سویڈن والوں نے بھی نیوجرسی اور ڈیلاویر کے کئی حصے آباد کئے لیکن انگریزوں نے انھیں بڑی

ہوشیاری سے ہرا کر نکال باہر کیا اور پوری تیرہ آبادیوں کا صرف ایک بلاک بنالیا۔ ادھر فرانس بھی نئی دنیا میں خاموش نہیں تھا۔ چمپلین نے سنہ ۱۶۸۰ء میں کنیڈا میں ایک شہر کیوبک نام سے آباد کیا۔ اس شہر سے پُرجوش مبلغ دریائے مسس سپی سے مڈ ولیسٹ کے قلب تک گئے اور ہندوستانیوں کے لئے تسبیح و تہلیل کے ساتھ ساتھ شاہ فرانس کے حق میں پرچار کرتے پھرے۔ مطلب صرف یہ تھا کہ ایک بڑے علاقے پر قبضہ جمالیں لیکن فرانسیسیوں کا مقصود زیادہ تر تجارت کا جال پھیلانا تھا اس لئے مسس سپی کی وادی اور کنیڈا میں انھوں نے حکومت کا جو ڈھانچہ کھڑا کیا وہ زیادہ تر تجارتی تعلقات پر مبنی تھا۔

سترھویں صدی کے شروع میں مرکزی اور جنوبی امریکہ پر ہسپانیوں نے مضبوطی سے پنجے گاڑ رکھے تھے لیکن اس علاقہ میں جہاں اب ریاستہائے متحدہ ہیں ان کے مقبوضات بہت کم تھے لیکن انھوں نے فلورڈا، ٹیکساس اور نیو میکسیکو کے علاوہ کیلیفورنیا کے ساحل پر بھی مشنری چوکیاں قائم کرلی تھیں اور ترقی کی دوڑ میں ہسپانوی اپنے ہم چشموں یعنی برطانیہ اور فرانس سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔

ذرا سوچئے تو کہ ریاستہائے متحدہ سترھویں صدی میں کیسی ہو گی؟ آیئے اس کا جواب ہم آپ کو بتائیں۔ یہ ایک خوبصورت زمین تھی اور اس قدر گھنے جنگلات سے بھرپور کہ گلہریاں بغیر زمین چھوئے ہوئے ایک درخت سے دوسرے درخت تک ہزاروں میل کودتی چلی جا سکتی

تھیں۔ بحرِ اوقیانوس کے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک مختصر سے میدان کا حاشیہ تھا جو آہستہ آہستہ بلند ہوتا چلا گیا تھا اور کوہ اپلاچین کے دامن سے جا ملتا تھا۔ وادی مسس سپی میں تقریباً ایک ہزار میل تک مغرب کی جانب جنگلات بھی تھے اور چراگاہیں بھی۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز اور آبادی کے لئے موزوں ترین جگہ تھی۔ بحرالکاہل کی جانب اس پہاڑی حصے کے پار کی زمین بھی بہت عمدہ تھی۔ یہاں بہترین بندرگاہیں تھیں۔ شاندار جنگلات تھے۔ مختصر یہ کہ جنّت ارضی کا نمونہ تھی اور ہندوستانی تو اس پر فدا تھے۔ وہ یہیں شکار کھیلتے تھے اور یہیں ماہی گیری کرتے تھے۔

مندرجہ بالا حالات نے اس زمین پر ایک اکھاڑے کی صورت پیدا کر دی تھی جہاں ہر قوم اس شاندار براعظم پر بالادستی حاصل کرنے کے لئے زور آزمائی کر رہی تھی

دوسرا باب

نوآبادیاتی نظام

ابتدائی زمانے میں انگریز آبادیوں کی زندگی بہت سخت اور اکھڑسی رہی اور یہ اکھڑپن اپنے مستقل نشانات چھوڑ گیا ہوا یوں کہ نیو انگلینڈ کا علاقہ چونکہ سرد اور پہاڑی تھا اس وجہ سے کھیتی باڑی میں مشکل پیش آتی تھی اور لوگوں کو اس ناموافق خطے میں پیٹ پالنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اس جانفشانی نے ان کی طبیعت میں کھرا پن پیدا کر دیا اور ان میں کچھ سرد مہری سی بھی آگئی ۔ ان حالات نے مذہبی بلکہ سخت قسم کے مذہبی ذہن کو بھی جنم دیا جو آج بھی امریکی فضا پر اثر انداز ہے ۔

یہ تو آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ انگلستان سے بہت سے لوگ وہاں کی مذہبی عصبیت سے گھبرا کر امریکہ آکر آباد ہوئے تھے ۔

ان مذہب کے مارے ہوؤں نے زیادہ تر میسیچوسٹس میں پناہ لی تاکہ اپنی مرضی کے مطابق خدا کی پرستش کر سکیں۔ یہ لوگ مذہب میں خفیف سی ترمیم کے بھی مخالف تھے۔ اور ان کے دینی راہبر سخت مذہبیت پر زور دیتے تھے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ۱۶۳۱ء میں ان کی عدالت عالیہ نے حکم جاری کر دیا کہ حکومت کے انتخاب میں صرف وہی لوگ رائے دے سکیں گے جو کسی گرجا کے سرگرم رکن ہوں۔ دیکھا آپ نے؟ قدیم دنیا کے مذہبی تعصب کے شکار نئی دنیا میں خود شکاری بننے لگے۔

ظاہر ہے اس طرح حکومت کا گرجا کی سرپرستی میں رہنا میسیچوسٹس کے تمام باشندے گوارا نہ کر سکتے تھے اور حکومت بھی ایسی کہ ذرا سی بھی مذہبی لغزش پر سخت سزائیں دیتی تھی حتیٰ کہ منکروں کو سزائے موت تک دی جاتی تھی چنانچہ شروع ہی سے ایک ایسا مخالف عنصر موجود رہا جو مذہب کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے ٹکرانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایسے لوگوں میں سب سے پہلے روجر ولیم کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ اچھے اور شریف گھرانے کا فرد تھا اور کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویٹ بھی تھا۔ ولیم نہ صرف مذہبی رواداری کا مؤید تھا بلکہ اس کا یہ بھی نظریہ تھا کہ مذہب اور سیاست علیحدہ علیحدہ دو چیزیں ہیں اور ان دونوں کو علیحدہ ہی رہنا چاہیے۔ اس نے یہ بھی آواز اُٹھائی کہ یہ زمین ہندوستانیوں کی ہے نہ کہ شاہ انگلستان کی۔ اس لئے ہمیں ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بات لوگوں کو ناگوار گذری اور اسے ۱۶۳۵ء میں قید

کردیا گیا۔ لیکن وہاں سے وہ نکل بھاگا اور اپنے معتمد ساتھیوں کو لے کر جزیرہ رھوڈ (Rhode) میں جا بسا اور اس جزیرے کے ہندوستانیوں سے زمین چھیننے کے بجائے خرید لی۔ اس نئی آبادی میں پوری مذہبی آزادی تھی۔ یورپ کے نکالے ہوئے خانہ بدوش یہودیوں کو آکر آباد ہونے کی کھلی اجازت تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ وہاں کی جمہوری حکومت میں بھی حصہ لے سکتے تھے۔ ولیم نے تقریباً اسی برس کی عمر میں اسی جزیرے میں انتقال کیا۔

مذہبی اختلافات کی بنا پر جن دوسرے لوگوں نے میسیچوسیٹس کو خیرباد کہا ان میں تھامس ہوکر، ہچنسن اور اس کی بیوی قابلِ ذکر ہیں۔ مسز ہچنسن چودہ بچوں کی ماں تھی اور یہ سب انگلستان میں پیدا ہوئے تھے جب وہ امریکہ آئی تو تقریباً چالیس سال کے لپیٹ میں تھی۔ یہاں آکر وہ ایسی چمکی کہ اچھی خاصی مذہبی رہنما بن گئی۔ لیکن جب اُس نے انفرادی اور اجتماعی طریقِ عبادت کے مسائل کو چھیڑا تو پادری ... اس سے ناراض ہو گئے۔ یہ معمولی سا اختلاف اتنا بڑھا کہ مسز ہچنسن اور اُس کے طرفداروں کو نیوہیمپ شائر میں پناہ لینی پڑی۔ مگر یہاں کے ہندوستانیوں نے ان سب کو ۱۶۴۳ء میں قتل کر دیا۔

تھامس ہوکر نے ۱۶۳۶ء میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہارٹ فورڈ کی بنیاد ڈالی۔ اس شہر میں ہر شخص کو حق رائے دہندگی دیا گیا

چاہے وہ کسی گرجا کا رکن ہو یا نہ ہو۔

اس طرح آہستہ آہستہ مذہبی رسہ کشی کم ہوگئی۔ البتہ میری لینڈ میں کچھ کھچاؤ باقی رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آس پاس کی آبادیوں سے پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگ آکر کافی تعداد میں وہاں آباد ہوگئے اور کیتھولک عقیدے کے لوگ اقلیت میں رہ گئے لیکن یہ تنازعہ آگے نہیں بڑھ سکا کیونکہ سنہ ۱۶۴۹ء میں اسمبلی نے "قانون رواداری" پاس کرکے تمام عیسائیوں کو عبادت اور عقیدے کی آزادی دے دی۔ اس کے بعد بھی اگرچہ کہیں کہیں اس قسم کے جھگڑے چلتے رہے مگر امریکہ نے قدیم دنیا میں شہرت حاصل کرلی اور لوگ اسے گوشہ عافیت سمجھنے لگے۔ برخلاف اس کے یورپ اس زمانے میں میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ کیتھولک ممالک اپنے پڑوسی پروٹسٹنٹ ملکوں سے برسرپیکار تھے۔ اور خود پروٹسٹنٹ بھی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے غرضیکہ سنہ ۱۶۱۸ سے سنہ ۱۶۹۷ء تک وہ دھاچوکڑی مچی کہ یورپ کا نقشہ بگڑ گیا۔ شاید ہی کوئی متنفس بچا ہو جو فوج میں بھرتی نہ ہوا ہو۔

ان حالات کی وجہ سے امریکہ ایک صدی تک ہر قوم کی آماجگاہ بنا رہا اور خاص طور پر یورپین اقوام کی تو یہ دلی تمنا رہی کہ ان آئے دن کی خونریزیوں سے بچ کر نئی دنیا میں آباد ہوں جہاں اطمینان سے پھلنے پھولنے اور ابھرنے کا موقع ملے۔ یہ خواہش آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

۱۶۶۴ء میں نیویارک بڑا خوبصورت شہر تھا اور اس پر ہالینڈ والوں کا قبضہ تھا آبادی تقریباً پندرہ سو افراد پر مشتمل تھی اور ہالینڈ کا ایک گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ وہی سلامی دار چھتیں، وہی پن چکیاں اور ہوبہو ویسی ہی دوکانیں اور گودام۔ ہالینڈ والوں کی تجارتی کوٹھیاں بھی دریائے ہڈسن کے کنارے کنارے ڈیڑھ سو میل تک پھیلی ہوئی تھیں یہی نہیں بلکہ نیوجرسی پر بھی ان کا قبضہ تھا۔ ہالینڈ کی تاریخ میں وہ دن بڑا منحوس تھا جب انگریزوں کا ایک دستہ نیویارک میں داخل ہوا اور ان کو اپنے تمام مال و متاع سے دستبردار ہوجانے کا حکم دیا گیا ان کی زبردست طاقت کے سامنے ہالینڈ والوں کو جھکنا پڑا۔ اس طرح امریکہ کے درمیانی ساحل کا علاقہ جو نیو انگلینڈ اور جنوبی امریکہ کو ملاتا ہے تاج برطانیہ کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ اسی اثنا میں حکومت برطانیہ میں کئی انقلاب آئے۔ جیمس اول اور چارلس اوّل کا دور ختم ہوا اور ۱۶۵۳ء کی خونریز جنگ کے بعد کرامویل برسر اقتدار آیا لیکن اس کی موت کے دو سال بعد ڈکٹیٹرشپ ختم ہوئی اور بادشاہت پھر سے قائم ہوگئی۔ ولیم اور میری نے انگریز قوم کو حکومت میں زیادہ نمایندگی دینے کا وعدہ کرکے تخت سنبھالا۔

یہ تمام انگریز حکمراں امریکہ کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے اچھی طرح باخبر تھے اس لئے وہ یہاں کی نوآبادیات پر کڑی نظر رکھتے تھے لیکن فاصلے کی دوری اور وقت کی ٹیڑھی ترچھی رفتار نے ان کی گرفت ڈھیلی کردی۔

اس سلسلہ میں اگرچہ انھوں نے کافی ہاتھ پاؤں مارے لیکن نتیجہ صفر سے آگے نہ بڑھا۔ پہلے پہل تو نوآبادیوں پر تاجر ہی حکومت کرتے تھے پھر موقر درباریوں اور ان کے معتمد لوگوں کو بادشاہ کی طرف سے ان آبادیوں کے پٹے لکھدیئے گئے۔ ان پٹہ داروں نے یہاں کے بسنے والوں کو اپنی مرضی کے مطابق حکومت بنانے اور اپنے معاملات خود طے کرنے کا موقع دے دیا۔ یہ رعایت شاہی مفاد کے خلاف پڑی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے پٹے منسوخ کردیئے گئے اور ان آبادیوں کو براہ راست شاہی انتظام میں لے لیا گیا اس کے علاوہ وہاں اور زیادہ سخت قوانین نافذ کردیئے گئے تاکہ خود مختاری کا جذبہ اُبھرنے نہ پائے۔ جب بادشاہ جیمس دوم نے ۱۶۸۶ء میں نیوانگلینڈ، نیویارک اور نیوجرسی کو ملاکر ایک شاہی صوبہ قرار دیدیا تو ان نوآبادیوں کے حالات ناقابل برداشت ہوگئے۔ سرایڈمنڈ اینڈراس گورنر بناکر بھیجاگیا وہ بہت سخت گیر حاکم تھا۔ اور یہ مقصد لے کر آیا تھا کہ جتنی زیادہ سے زیادہ دولت وہ اپنے بادشاہ کے لئے سمیٹ سکے سمیٹ لے۔ اُس نے آتے ہی یہاں کے باشندوں کی تمام عدالتیں توڑدیں اور خودمختار حاکم بن گیا۔ اخباروں پر سنسر بٹھادیا اور بھاری بھاری ٹیکس عائد کردیئے۔ اس کی حکومت میں نہ عوام کی کوئی آواز تھی اور نہ ہی ان کا کوئی دخل تھا۔

وہ دن یہاں کے باشندوں کے لئے بڑا مبارک اور اینڈراس کے لئے بڑا منحوس تھا جب جیمس کے تخت سے اُتار دیئے جانے کی خبر

امریکہ پہنچی میسیچوسیٹس کے مظلوموں نے فوراً ہی اس ظالم کو پکڑ لیا اور قید کر کے انگلستان واپس بھیجدیا تاکہ آنے والا بادشاہ اس کا فیصلہ کرے۔ نیویارک پر اینڈراس کا نائب حاکم تھا وہاں کے عوام نے بھی اس کے ساتھ یہی کچھ کیا اور دو سال تک ایک جرمن لیڈر کی رہنمائی میں آزادی سے زندگی بسر کی۔

ورجینیا کا سر ولیم برکلے گورنر تھا۔ سنہ ۱۶۷۵ء میں جب سرحدی آبادی کو وحشی قبائل نے زیادہ پریشان کیا تو عوام نے اس سے داد رسی چاہی۔ اس نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بھلا ان مخمصوں میں کیوں پڑتا اس کا مقصد تو محض دولت جمع کرنا تھا۔ چنانچہ وہاں بھی اس قسم کا انقلاب آیا اور بیکن نے مٹھی بھر جماعت کو لے کر ان زرکشوں سے نمٹنے کی ٹھانی۔ برکلے نے بیکن کو باغی قرار دے دیا اور اس کا سر لانے والے کو انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ ان حالات نے خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دی اور بیکن کے حامی چھا گئے لیکن وقت کی بات کہ عین اس وقت بیکن کا انتقال ہو گیا جب برکلے کی گورنری آخری سانس لے رہی تھی۔ اب بیکن کی جماعت کا کوئی سر دھرا نہ رہا۔ برکلے نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کو بری طرح کچل کر رکھ دیا۔ اس قدر خونریزی ہوئی کہ برکلے کو انگلستان واپس بلا لیا گیا اور اس کی بڑی بے عزتی کی گئی۔

ان تمام حقائق کے باوجود لوگ زیادہ تر انگلستان سے ہی محبت

کرتے تھے اور نہ صرف خود جاتے آتے رہتے تھے بلکہ اپنے بچوں کو بھی تعلیم کے لئے کیمبرج اور آکسفورڈ ہی بھیجتے تھے اس لئے تاجِ برطانیہ کا وقار مزید ایک صدی تک اور قائم رہا۔

امریکہ کی دولت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ زراعت زوروں پر تھی اور تمباکو اور چاول کی کاشت نے جنوبی کسانوں کو ایک دو پشتوں میں ہی کافی مالدار کر دیا تھا۔ لیکن نیو انگلینڈ میں حالات مختلف تھے۔۔ وہاں کی تنگ وادیاں اور کمزور مٹی بڑے پیمانہ پر ناقابلِ کاشت تھی چنانچہ وہاں کے لوگوں نے بجائے کاشت کے تجارت کی طرف ——————

—————— توجہ کی۔ عمارتی لکڑی کی ان کے یہاں کمی نہ تھی بلکہ اتنی افراط تھی کہ انھوں نے جہاز بھی بنائے اور دساور بھی بھیجی اسی طرح آس پاس کے ساحلوں پر مچھلی بڑی کثرت سے ملتی تھی۔ فر بھی عمدہ اور ارزاں دستیاب ہوتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے ان لوگوں نے فائدہ اُٹھایا اور کافی دولت پیدا کی۔ برخلاف اس کے دوسری پسماندہ آبادیاں ہر چیز کے لئے انگلستان کی طرف دیکھتی تھیں۔ اگرچہ وہاں کے مال کے بدلہ میں انھیں تمباکو، لکڑی اور کھالیں وغیرہ دینی پڑتی تھیں۔ اس قسم کے تبادلے کو تاریخ میں "مرکنٹائل سسٹم" کا نام دیا گیا ہے۔ اس سسٹم کا اصل فائدہ انگلستان کو ہی پہنچتا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان آبادیوں

کے قیام پر انگلستان نے روپیہ بھی اسی لئے خرچ کیا تھا۔ بے چارے نوآباد لوگوں کو اپنے مال کی وہی قیمت لینی پڑتی تھی جو انگلستان کے تاجر لگاتے تھے جب کہ انگلستان کے تاجر اپنے مال کی منہ مانگی قیمت وصول کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ اس خسارے کی تجارت پر مجبور تھے کیونکہ قوانین ہی ایسے وضع کئے گئے تھے کہ نہ یہ اپنے لئے کچھ بنا سکتے تھے اور نہ کسی اور ملک سے تجارت کر سکتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب یہ انگریز آبادیاں خوشحال اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو چلیں۔ نیو انگلینڈ والوں نے اپنی تجارت اور صنعت کو پھیلانا چاہا۔ لیکن بادشاہ چارلس دوم نے "جہاز رانی کا قانون" پاس کرکے انھیں دبا دیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ یہ قانون سختی کے ساتھ لاگو نہیں کیا گیا اور چوری چھپے انھیں فرانس اور اسپین کے جزائر کے ساتھ تجارت کرنے کا موقع مل گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف تک ان تمام بستیوں کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اگرچہ ان میں ڈچ بھی تھے اور فرانسیسی بھی، اسکاٹ لینڈ والے بھی تھے اور جرمن بھی لیکن غلبہ انگریزوں کا ہی تھا۔ ان آزاد لوگوں کے ساتھ افریقہ کے تقریباً ڈھائی لاکھ حبشی بھی تھے جو زرخرید غلاموں کی حیثیت سے رہتے تھے۔

اس کے علاوہ امریکہ کے دوسرے باشندے ہندوستانی تھے جو آہستہ آہستہ مغرب کی طرف ہٹتے جا رہے تھے۔ خیال ہے کہ جب

سفید اقوام امریکہ میں داخل ہوئیں تو ان ہندوستانیوں کی تعداد اسّی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان ہندوستانیوں نے نوآباد لوگوں سے کئی مرتبہ ٹکر لی اور سیکڑوں نوآبادوں کو قتل کردیا۔ سب سے خونریز معرکہ ۱۶۳۷ء میں ہوا جو جنگ پیکٹ کہلاتا ہے۔ اس جنگ میں سفید اقوام نے ہندوستانیوں کا ایک گاؤں جلاکر خاک کردیا جس میں پانچ سو مرد عورتیں اور بچے بھسم ہوگئے۔

میساچوسٹس کے مذہبی رہنما تعلیم کی طرف کافی مائل تھے۔ چنانچہ ۱۶۳۶ء میں ہارورڈ کالج کا قیام عمل میں آیا اور ۱۶۵۰ء میں تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ اس کے برخلاف نیوانگلینڈ والے مذہبی تنگ نظری میں مبتلا تھے اور وہی پرانا سلسلۂ دارودرسن جاری تھا۔ نیوانگلینڈ کی ساری زندگی گرجا کے گرد گھومتی نظر آتی تھی لیکن ایک خوبی بھی تھی۔ ان میں جذبۂ آزادی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ تھا اور انھوں نے اپنی حکومت کا ڈھانچہ جمہوریت کے طرز پر بنایا تھا لیکن دریائے پٹومک کے جنوب میں جہاں ورجینیا اور کیرولینا کے باغات تھے جمہوریت زیادہ نمایاں نہیں تھی کیونکہ آبادی یکجا نہیں تھی اور مل کر بیٹھنے کے مواقع کم تھے۔

ترقی کے ساتھ ساتھ ایک اور خرابی بھی پیدا ہوئی یعنی جنوبی حصّہ میں امیر اور غریب کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا چلاگیا کیونکہ یہاں کے باشندے کافی مالدار تھے اور اپنے کھیتوں کا کام زرخرید غلاموں سے لیتے تھے۔ اسی طرح چھوٹے کسانوں کا طبقہ بھی بے حد غریب تھا۔

غرضیکہ لوگ یا تو بہت امیر تھے یا بہت غریب۔ نیو انگلینڈ کی طرح متوسط طبقہ اس حصے میں بالکل نہیں تھا۔ ان دونوں علاقوں کا یہ فرق وہاں کے طرز تعمیر سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ شمالی علاقوں میں لوگوں کے پاس صاف ستھرے چوبی مکان کثرت سے تھے۔ لیکن جنوبی حصوں میں یا تو بڑے بڑے محلات تھے یا بہت ہی معمولی قسم کے لکڑی کے کھوکھے۔ حبشیوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو بیچارے کئی کئی مل کر ایک کھوکھے میں رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کہیں کہیں غلاموں کے ساتھ زیادتی بھی ہوتی تھی لیکن پھر بھی مجموعی زندگی ایک پرسکون دھارے پر بہہ رہی تھی۔ لوگ ناچ گانے اور سیر و شکار کی خوش فعلیوں میں مصروف رہتے تھے۔

اٹھارہویں صدی میں پنسلوینیا کو گلزار بنا دینے کا سہرا ولیم کے سر ہے۔ یہاں کے لوگ ہشاش بشاش نظر آتے تھے اور اپنے ہندوستانی پڑوسیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ قوانین منصفانہ تھے اور تعلیم عام تھی سب سے بڑی بات یہ کہ مذہبی رواداری اور اتحاد تھا۔ امریکہ کے اسی وسطی خطے میں ایک اور شہر فیلڈیلفیا بھی اس صدی میں معرض وجود میں آیا اس کی ترقی اور خوش حالی میں بنجمن فرینکلن کا بڑا حصہ ہے۔

اب یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان مختلف حالات اور نظریات کے باوجود امریکہ کے بسنے والے آزادی کے مسئلہ پر بھائیوں کی طرح کیوں کر متحد ہو گئے۔ یہی چیز در اصل ان نو آبادیات کی تاریخ کا حاصل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے آپس کے تعلقات کو مزید مستحکم کرنے

کے لئے ڈاک اور تار کا سلسلہ قائم کیا اور پھر آہستہ آہستہ اخبارات اور اشتہارات کی طرف توجہ کی تاکہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکیں اور اس طرح جب ایک آبادی کے لوگ دوسری آبادی کے حالات سے باخبر رہنے لگے تو آزادی کی طرف میلان بڑھنے لگا۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ خلیج میسچوسٹیس اور پلائی متھ وغیرہ کو نیو انگلینڈ کے ساتھ مدغم کر دیا گیا۔ یہ دوستی اور اتحاد عمل کا پہلا مظاہرہ تھا جس میں ایک دوسرے کے امن و حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کے بعد تجارت کو ترقی دینے کی کوششیں کی گئیں اور اگرچہ ان کا کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہ نکلا تاہم اتحاد کو مزید استحکام حاصل ہوا۔

یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ امریکہ کی برطانوی آبادیوں کے متحد ہونے کی محرک در اصل وہ رسہ کشی اور چھینا جھپٹی تھی جو اس براعظم پر قبضہ جمانے کے لئے مختلف اقوام میں جاری تھی۔ برطانوی نوآبادوں نے اگرچہ ۱۶۹۰ء تک اسپین اور فرانس کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر کوئی توجہ نہ دی لیکن جب یہ قومیں خود انگلستان پر نظر پھینکنے لگیں اور ان نوآبادیوں کی سرحدوں پر چھیڑخانی شروع ہو گئی نیز جب ہسپانیوں اور فرانسیسیوں کے اُکسانے پر ہندوستانیوں نے حملے شروع کر دیئے تو ان انگریز نوآبادیوں میں کچھ حرارت پیدا ہوئی اور اس مشترک خطرے کے احساس نے انھیں متحد ہو کر چلنا سکھایا۔

فرانس کا مقبوضہ علاقہ بہت وسیع تھا اور اس میں وہ تمام

علاقے شامل تھے جنھیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کہا جاتا ہے لیکن اتنی لمبی چوڑی زمین پر صرف اٹھارہ ہزار فرانسیسی آباد تھے جب کہ مشرق میں برطانوی نوآبادوں کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ لیکن فرانسیسیوں کی یہ ہوشیاری تھی کہ انھوں نے ہندوستانیوں سے نہ صرف بھائی چارہ قائم کرلیا بلکہ روٹی بیٹی کا لین دین شروع کردیا اور ان کی ہر اُونچ نیچ میں کام آنے لگے لیکن انگریز اپنے آپ کو ان حالات کے سانچے میں نہیں ڈھال سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرانسیسی باوجود اقلیت میں ہونے کے انگریزوں سے زیادہ طاقتور ہو گئے۔ چنانچہ امریکہ پر پوری طرح قبضہ کرنے کی جدوجہد ۱۶۸۹ء میں شروع ہوئی جو تقریباً ستر بچھتر برس تک جاری رہی۔ اس کا آغاز شاہ ولیم کی اس جنگ سے ہوتا ہے جو فرانس اور انگلستان کے مابین ہوئی۔ جنگ کے شعلے امریکہ پہنچے اور انگریز نوآبادوں نے اپنی بقا کے لئے جدوجہد کی۔

نیویارک میں ایک ایسی آبادی تھی کہ اگر فرانسیسی اس کو انگریزوں سے چھین لیتے تو برطانوی نوآبادیاں دو حصّوں میں تقسیم ہوجاتیں اور ہر حصّہ بجائے خود کمزور ہوکر رہ جاتا۔ چنانچہ کناڈا کے فرانسیسی گورنر نے نیویارک کی سرحدوں پر مسلسل حملے کئے اور اپنے ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کئی آبادیاں بمعہ نیویارک کے صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیں لیکن شاہ ولیم کی جنگ بغیر کسی قطعی فیصلے کے ۱۶۹۷ء میں ختم ہوگئی اس لئے یہاں بھی جنگ کی وہ گرم بازاری نہ رہی۔

فرانس کے بادشاہ لوئیس نے اپنی طاقت میں مزید اضافہ کرنے کے

لئے اسپین کے تخت پر اپنے پوتے کو بٹھادیا۔ اب یہ دونوں کیتھولک متحد ہوکر پروٹسٹنٹ (انگلستان) کی گوشمالی کے لئے بڑھے لیکن انگلستان بھی تازہ دم ہو چکا تھا اور جب سنہ ۱۷۰۱ء میں دوبارہ جنگ چھڑی تو انگلستان نے ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ فرانس کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس جنگ کے اثرات بھی امریکہ پہنچے اور ہندوستانیوں نے کرولیناس اور نیو انگلینڈ پر بڑے کامیاب حملے کئے۔ لیکن سنہ ۱۷۱۳ء میں ایک صلحنامہ ہوا اور چونکہ جنگ میں انگریزوں کا پلّہ بھاری تھا اس لئے فرانس نے نیو فاؤنڈلینڈ اور دوسرے اہم مقبوضات دے کر اپنی جان چھڑائی۔ اس کے بعد سنہ ۴۸-۱۷۴۴ء میں جو جنگ شاہ جارج کے زمانے میں ہوئی اس میں ان نوآبادیوں کی فوجوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ پہلی جنگوں میں تو انگریز نوآبادیوں کی فوجوں کی تھوڑی بہت مدد کرتے تھے اس لئے اُنھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی تھی لیکن شاہ جارج کے زمانے میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں اور فرانسیسی افواج کے مقابلہ میں ایسی بےجگری سے مقابلہ کیا کہ ان کی دھاک بیٹھ گئی لیکن جنگ کے اختتام پر جب شاہ جارج نے فرانسیسیوں کو مقبوضہ علاقہ واپس کیا اور تاوانِ جنگ ادا کیا تو بیچارے نوآباد لوگوں کی تمام خوشیوں پر پانی پھر گیا۔

امریکہ پر قبضہ جمانے کے سلسلے میں انگلستان اور فرانس کے درمیان فیصلہ کُن جنگ سنہ ۱۷۵۶-۶۳ء میں ہوئی جس کو "ہفت سالہ جنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لڑائی نہ صرف امریکہ میں ہی لڑی گئی بلکہ اس نے

تقریباً ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگ کی تیاریاں کافی عرصہ سے دونوں طرف ہو رہی تھیں اور یہ طے تھا کہ اس جنگ میں پوری قوت جھونک دی جائے گی۔ اس سلسلے میں برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں کی ایک میٹنگ بلائی جس میں امریکہ کے بڑے بڑے سنجیدہ لوگ شریک ہوئے اور فرانسیسیوں کو امریکہ سے ہمیشہ کے لئے نکال دینے کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں بنجن فرنیکلن نے یہ تجویز پیش کی:-

"نوآبادیوں کی تمام اسمبلیوں سے نمائندے لے کر اڑتالیس ممبروں کی ایک کونسل قائم کی جائے اور یہ کونسل تمام نوآبادیوں کی ایک مشترک فوج کی تنظیم کرے۔ عوام کے معاملات کو سلجھائے اور تھوڑا سا ٹیکس عاید کرے تاکہ اس کی آمدنی سے اپنے اخراجات چلا سکے۔ اس کا صدر بادشاہ مقرر کرے اور اس کو اختیار دیا جائے کہ وہ اسمبلی کے پاس کئے ہوئے قوانین پر اپنا فیصلہ دے اور فوجی کمانڈروں کا تقرر کرے۔" لیکن فرنیکلن کی یہ تجویز گر گئی کیونکہ اس میں حد سے زیادہ مرکزیت پیدا ہوتی تھی اور نوآبادیوں کے گورنروں اور ان کی اسمبلیوں کا اختیار ختم ہوا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ برطانوی حکام کو بھی خوف ہوا کہ اتنی مضبوط مرکزیت ان حالات میں جب کہ جنگ کے بادل سروں پر منڈلا رہے ہوں کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ تجویز پاس نہ ہو سکی تاہم امریکہ کی تاریخ میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے

کیونکہ اس نے نوآبادوں کو اتحاد اور مرکزیت کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جس نے آگے چل کر ایک ایسی ملک گیر جماعت کو جنم دیا جو امریکہ کی آزادی کے ابتدائی دور میں رہنمائی کرتی رہی۔ بہرحال اس تجویز کے بعد دوسرا کوئی مؤثر لائحہ عمل مرتب نہ کیا جا سکا اور بالآخر یہی طے پایا کہ ہر آبادی اپنے اپنے طور پر برطانوی افواج کی امداد کرے۔

صرف الگینیز ——— ہی ایک ایسا علاقہ تھا جو برطانیہ اور فرانس دونوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو بھی اس علاقے پر قابض ہوتا وہ دوسرے کو بڑی آسانی سے امریکہ سے دھکیل کر باہر نکال سکتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کو اپنے تصرف میں لانے کے لئے فرانس نے دریائے اوہیو کے کنارے قلعوں کی تعمیر شروع کر دی۔ اس پر ورجینیا کے گورنر نے جارج واشنگٹن کی سرکردگی میں ایک دستہ بھیجا کہ انھیں تعمیر سے باز رکھے اور انھیں یہ بتائے کہ یہ علاقہ شاہ برطانیہ کی ملکیت ہے۔ واشنگٹن نے اپنا مطالبہ منوانے کے لئے وہیں ایک قلعہ بنوالیا تاکہ مستقل طور پر وہاں ایک فوجی چھاؤنی ڈال دے۔ لیکن اس کے پاس سپاہی کافی نہ تھے لہٰذا جب فرانسیسیوں نے واشنگٹن پر حملہ کیا تو اسے ہتھیار ڈال دینے پڑے اس شکست سے برطانیہ نے جوش میں آکر فوج کی پوری دو رجمنٹیں روانہ کر دیں لیکن ان کے کمانڈر نے واشنگٹن کی نصیحت کے باوجود انگریزی طرز پر یعنی ساری فوج کو ایک جگہ جمع کر کے حملہ کر دیا۔ فرانسیسیوں اور ہندوستانیوں نے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں

میں بٹ کر اور درختوں وغیرہ کی آڑ لے کر جنگ لڑی۔ دوسرے یہ کہ انگریزوں کی سُرخ وردیاں دُور سے نظر آتی تھیں اور دشمن بڑی آسانی سے ان پر نشانہ باندھ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج بُری طرح پسپا ہوئی اور تقریباً ایک ہزار سپاہی ختم ہو گئے۔

بہت سی نوآبادیوں نے فوجی دستے بھیجے لیکن اس کے باوجود فرانس کو اور کئی فتوحات حاصل ہوئیں جس کی وجہ برطانوی حکام اور نوآباد عوام کا عدم اتحاد ہے اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برطانوی کمانڈر نوآباد سپاہیوں کو کمتر سمجھتے تھے۔

آخر ۱۷۵۷ء میں برطانیہ کو ولیم پٹ جیسا قابل جرنیل مل گیا جو نہ صرف جوشیلا اور اپنی ہٹ کا پکا تھا بلکہ فنِ جنگ کا بھی بہترین ماہر تھا اس نے برطانوی اور نوآبادیاتی فوجوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے فرانسیسیوں پر بہت کامیاب چھاپے مارے اور ان کے کئی مضبوط قلعے چھین لئے جس میں قلعہ ڈیکونیز بھی شامل تھا۔ اس قلعہ کا نام بعد میں پٹ کے نام پر پٹسبرگ رکھا گیا۔

۱۷۵۹ء میں برطانیہ نے کناڈا پر ایک فیصلہ کُن حملہ کیا اور ایسا کامیاب شبخون مارا کہ فرانسیسیوں کے ہوش اڑ گئے۔ اس حیرت انگیز فتح سے فرانسیسی ایسے خائف ہوئے کہ چار سال تک چپکے بیٹھے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کا سکہ جم گیا۔ ایک مرتبہ جب اسپین فرانس کی مدد کو آیا تو برطانیہ نے اسے بھی منہ توڑ جواب دیا اور اس کی

نوآبادیاں (کیوبا، منیلا، فلپائن وغیرہ) چھین لیں۔ اسی دوران میں فرانس کی جو مقبوضات ہندوستان میں تھیں ان میں سے بھی بہتوں کو برطانیہ نے فتح کرلیا۔ مجبور ہوکر آخر فرانس نے صلح کی پیشکش کی اور ۱۷۶۳ء میں پیرس میں ایک صلح نامے پر دستخط ہوئے جس کی رو سے کناڈا کا پورا علاقہ اور دریائے مسسپی کا مشرقی خطہ فرانس نے برطانیہ کے حوالے کردیا۔ ہاں انھیں اتنی اجازت دیدی گئی کہ وہ نیو فاؤنڈلینڈ کے ساحل کے پاس ماہی گیری کے لئے دو چھوٹے چھوٹے جزیرے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں لیکن ان میں کوئی فوجی طاقت جمع نہیں کرسکتے۔ یہ جزیرے آج تک فرانسیسیوں کے قبضے میں ہیں۔ اس سات سالہ جنگ نے نئی دنیا سے فرانس کا پوری طرح صفایا کردیا اور اب انگلستان کا اس خطے میں صرف ایک حریف یعنی اسپین رہ گیا لیکن ان بیچاروں سے پہلے ہی کچھ زیادہ تعلق نہ تھا کیونکہ یہ زیادہ تر جنوبی امریکہ میں میکسیکو تک محدود تھے۔

امریکی نوآبادوں کے لئے فرانس کی شکست کافی اہمیت رکھتی تھی۔ اس شکست نے انھیں سب سے بڑا سبق تو متحد ہونے اور اپنے مشترک مفاد کے لئے فوج کی تنظیم کرنے کا دیا۔ دوسرے انھیں اپنی طاقت اور فراست کا احساس کرایا۔ اگر برطانیہ کی باقاعدہ فوج کو الگ بھی کردیا جائے پھر بھی نوآبادیوں کے دستوں کا اس جنگ میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس جنگ میں یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جارج

واشنگٹن بہترین سپاہی تھا۔ مختصر یہ کہ اس جنگ نے انگلینڈ سے آگے مغرب کی طرف بڑھنے اور پھیلنے کے لئے راستہ صاف کر دیا جہاں سینکڑوں میل زمین پڑی تھی اور پھلنے پھولنے کے بے شمار مواقع میسّر تھے۔

تیسرا باب

امریکی انقلاب

امریکی انقلاب کے متعلق اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح جارج سوم نے نوآبادیوں کو آزادی سے محروم رکھا۔ کس طرح انھیں حکومت کے نظم و نسق سے علیحدہ رکھ کر ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبایا اور کس طرح ان کے مکانوں اور محلوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ دبنے اور ظلم سہنے کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد اس کا ردعمل شروع ہو جاتا ہے جسے لوگ بغاوت یا انقلاب کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں بھی بظاہر یہی کچھ ہو رہا تھا لیکن اندرونی طور پر مزید کچھ ٹھوس حقائق تھے جن کا نتیجہ انقلاب کی صورت میں نکلا۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ برطانیہ اور نوآبادیوں کے وہ تعلقات تھے جن میں خلوص کی بجائے تضاد ہی تضاد تھا۔

امریکنوں کے نظریئے کے مطابق ان کی تیرہ نوآبادیاں بالکل اسی طرح الگ الگ حکومتیں تھیں جیسے آج کل کے دور میں کناڈا اور آسٹریلیا باوجود تاج برطانیہ کے وفادار ہونے کے بالکل علیحدہ حکومتیں ہیں۔ جو جو لوگ ان نوآبادیوں میں بستے تھے وہ یقیناً انگریز تھے اور وہ بھی دوسروں کی طرح ان تمام مراعات اور حقوق کے طالب تھے جو دوسرے برطانوی باشندوں کو حاصل تھے۔ امریکی باشندوں کو یہ گوارا تھا کہ بادشاہ گورنر بھیجے۔ وہ یہ بھی منظور کرنے کے لئے تیار تھے کہ شاہی گورنر ہی ان کی اسمبلیوں کی صدارت کرے لیکن حق خود اختیاری سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ ادھر برطانوی حکام اس بات کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے کہ ان کو خود اختیاری حکومت کا حق دیا جائے۔ ان کی نگاہ میں یہ بدقسمت نوآباد اس عزت کے مستحق ہی نہ تھے کہ انھیں دوسرے برطانوی باشندوں کی طرح برابری کا درجہ دیا جائے۔ ان کے خیال میں ان امریکنوں کا بس یہی فرض تھا کہ وہ برطانوی مال کی کھپت کے لئے نئی نئی منڈیاں بناتے رہیں اور برطانوی صنعت کے لئے اشیاء خام مہیا کرتے رہیں۔ چنانچہ ڈیڑھ سو برس تک ان غریبوں کو حکومت کی سختیاں بھی جھیلنی پڑیں اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے ہاتھوں کھونی پڑی۔ ۱۷۶۳ء میں جب کہ جنگ ختم ہوگئی اور اسپین اور فرانس کا کوئی کھٹکا نہ رہا تو اب حکومت برطانیہ نے ان امریکنوں کو خوب دیدے دکھائے اور اچھی طرح پیسنا شروع کیا۔ دراصل اب وقت آیا تھا کہ وہ جہازرانی کے قوانین

سختی کے ساتھ نافذ کریں تاکہ امریکہ کا تمام وکمال تجارتی فائدہ صرف انگلستان کو پہنچے اور ٹیکسوں کی بھرمار کر کے اپنے خزانوں کو پُر کردیں جو پچھلی جنگ میں خالی ہوچکے تھے۔

آپ خود ہی سوچئے کہ کون غلط راستہ پر تھا اور کون صحیح۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ در اصل یہ بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ امریکی لوگ اپنی ایک ایسی علیحدہ اور متحد حکومت چاہتے تھے جو تاجِ برطانیہ کی وفادار تو ہو لیکن اپنے معاملات میں آزاد ہو۔ اس کے برخلاف برطانوی حکام صرف ایک مرکزی حکومت کا قیام کافی سمجھتے تھے جو انگلستان میں بادشاہ کی سرپرستی میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ یہ دونوں متضاد خیال اپنی اپنی جگہ اپنے مفاد کے مطابق کام کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نتائج بھی متضاد ہی برآمد ہونے تھے جن پر دونوں ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ بدگمان ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ دونوں آپس میں ٹکرا جائیں اور وہی ہوا بھی۔ جب برطانیہ نے مغربی خطے پر قبضہ کرلیا تو اسے ایک اور مشکل پیش آئی یعنی یہ کہ اس علاقے میں وہ ہندوستانی آباد تھے جن کی فرانس سے دوستی تھی چنانچہ فرانس کے اُکسانے پر انھوں نے بغاوت کردی اور برطانیہ سے کئی قلعے چھین لئے۔ ہندوستانیوں کی اس بغاوت نے مزید بدگمانی پیدا کردی اور برطانیہ نے بے گناہ نوآبادوں پر گرفت اور بھی سخت کردی۔ خود اختیاری حکومت کا ایسے حالات میں تو کوئی

سوال نہ تھا اس وقت تو صرف فوجی طاقت کی ضرورت تھی جو سرکش عناصر کو دبا سکے۔ اس لئے برطانوی حکام نے اس علاقہ کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بستی بسانے کے لئے وہ علاقہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جو نو آباد پہلے سے وہاں موجود تھے ان کو مشرقی علاقے میں بھیجدیا گیا۔ اور اعلان کردیا گیا کہ اس علاقہ کی اگر کوئی زمین بک سکتی ہے تو صرف تاج برطانیہ کے ہاتھ۔ دوسرا کوئی نہیں خرید سکتا اس کے علاوہ بادشاہ نے اپنے ایجنٹ مقرر کردیئے تاکہ وہ حکومت برطانیہ کی طرف سے فر کی تجارت کریں۔ اس صورت حال پر امریکی باشندوں نے سخت احتجاج کیا اور ان کا احتجاج یقیناً حق بجانب تھا کیونکہ فرانس سے جنگ کے دوران میں انھوں نے برطانیہ کے ساتھ نہ صرف پورا پورا اتحاد عمل پیش کیا تھا بلکہ ان کو فوجی امداد بھی دی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی امداد اور تعاون سے برطانیہ کو کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ لہذا جنگ ختم ہوجانے کے بعد فتح کے نتائج اور فتح کی خوشیوں میں ان کا بھی حصّہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن حکومت میں تو کیا انھیں تجارت میں بھی کوئی حصّہ نہیں دیا گیا بلکہ اُلٹا اس فوج کے خرچ کا بار ان پر تھوپ دیا گیا جو تاجِ برطانیہ کے مفادات کی حفاظت کے لئے امریکہ بھیجی گئی تھی۔ اس فوج کی تعداد کئی ہزار تھی۔

گرین ول جو ۱۷۶۴ء میں برطانیہ کا وزیر اعظم تھا امریکہ سے تقریباً بالکل ناواقف تھا اور جو کچھ تھوڑا بہت اُس نے امریکہ کے متعلق سنا تھا

اس کی بنا پر وہ یہاں کے باشندوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ لہذا اُس نے جہاز رانی کے قوانین کو اور بھی سخت بنا دیا اور اخبارات واشتہاروں پر ٹیکس بھی لگا دیا اور جب ان نئے ٹیکسوں کا قانون (اسٹامپ ایکٹ) برطانوی پارلیمنٹ نے پاس کیا تو نہ برطانوی اور نہ امریکی کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ امریکی ان آئے دن کی ناانصافیوں کی وجہ سے اس قدر حساس ہوگئے تھے کہ سوئی کے چبھنے کو بھی تکلے کا گھاؤ سمجھتے تھے۔ جیسے ہی ایکٹ پاس ہوا سارے امریکہ میں آگ سی لگ گئی۔ ورجینیا کے پیٹرک ہنری نے علی الاعلان کہا کہ ورجینیا کے باشندوں پر صرف ورجینیا کی اسمبلی ہی کوئی ٹیکس عائد کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ورجینیا کی اسمبلی نے اس سے زیادہ سخت الفاظ میں احتجاجی ریزولیشن پاس کیا۔ دوسرے علاقوں میں بھی اس قسم کی چیخ و پکار ہوئی اور ہر جگہ اس قانون کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیو انگلینڈ، نیویارک اور پنسلوینیا میں فساد شروع ہوگیا۔ جگہ جگہ "آزادی کے پروانے" کے نام سے جماعتیں قائم ہوگئیں اور اچھا خاصا ادھم مچ گیا۔ لیکن واہ رے برطانوی حکمرانو، یہ سارا شور و شر ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا تھا۔ وہ اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے حالانکہ پارلیمنٹ ہر طبقہ اور ہر نکتۂ خیال کے لوگوں کی نمائندہ ہوتی ہے اس میں ہر شخص کے جذبات و احساسات کا احترام کیا جاتا ہے۔ واہ کیا احترام تھا کہ ہزاروں لاکھوں نفوس بے چین چیخ

رہے ہیں، اظہار ناراضگی کر رہے ہیں مگر عوام کی اس نمائندہ پارلیمنٹ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ اُف کتنا بڑا تضاد تھا یہ قول و فعل کا!

جب امریکی عوام کسی طرح نہ مانے اور کھل کر سامنے آگئے تو برطانوی حکام کی آنکھیں کچھ کھلیں اور اسٹامپ ایکٹ ایک سال کے بعد ختم کر دیا گیا۔ اس کے منسوخ ہونے پر امریکی عوام خوشی سے اچھل پڑے۔ یہ ان کی پہلی بات تھی جو انھوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر برطانیہ سے منوائی تھی۔ لیکن ابھی ان کے قہقہے پوری طرح سے نکلے بھی نہ تھے کہ ایک اور قانون پاس ہوگیا جس کی رو سے درآمد کئے ہوئے شیشے، رنگ، سیسے، کاغذ اور چائے پر ٹیکس لاگو ہوگیا۔ اسی قانون میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ زمین کی لگان سے شاہی گورنروں کی تنخواہیں ادا کی جائیں اس پر پھر شور مچا اور سارے امریکہ میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی برطانوی مال کا قطعی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس اقدام پر برطانیہ بلبلا اُٹھا ان تمام تحریکات میں میسچوسٹس سب سے آگے تھا اس لئے اس پر سب سے پہلے نزلہ گرا۔ وہاں کی اسمبلی توڑ دی گئی اور شہر کو فوج کی نگرانی میں دے دیا گیا مگر یہ شورش پھر بھی نہ دبی۔ امریکی شہریوں اور برطانوی فوجوں میں جگہ جگہ ٹکراؤ ہوا۔ برطانیہ نے بھر بھر کر طاقت استعمال کی لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ برطانیہ کی پالیسی قدم قدم پر ناکام ہو رہی تھی اور اس کے لیڈروں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا راہ اختیار

کی جائے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ان پر مزید سختی کی جائے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اس کے حق میں نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں مراعات دی جائیں تاکہ وہ لوگ برطانوی مال کا بائیکاٹ کر کے انگلستان کی تجارت کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اسی طرح ایک قضیہ چائے پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ قصہ یہ تھا کہ انگلستان میں چائے کا ذخیرہ ضرورت سے زیادہ ہوگیا چنانچہ شاہ جارج نے وہ چاء امریکہ میں کھپانے کے لئے بھیجدی لیکن ایسے نرخ پر کہ تاجروں کو بجائے کچھ منافع کے الٹا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ تاجروں نے یہ نقصان کا سودا جہازوں سے ہی نہیں اُتارا۔ بڑے احتجاجی جلسے ہوئے اور آخر کچھ امریکنوں نے ہندوستانیوں کا بھیس بدل کر جہازوں پر ہلہ بول دیا اور ساری چائے سمندر میں غرق کردی۔ اب تو بادشاہ کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے شرارت پسندوں کو سزا دینے کے احکامات صادر کردیئے اور خاص طور پر بوسٹن پر عتاب نازل ہوا کیونکہ چائے بوسٹن کے ساحل پر غرق کی گئی تھی۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب تک بوسٹن والے چائے کی قیمت ادا نہ کردیں وہ سمندر کے راستے کسی قسم کی تجارت نہیں کرسکتے۔ بوسٹن میں ہر قسم کے جلسے جلوس پر سخت پابندی لگادی گئی اور فوج کی ایک بڑی جماعت کے سپرد کردیا گیا۔ اس تعزیری کارروائی سے امریکہ میں سخت بے چینی پھیل گئی اور فیلڈلیفیا میں ساری آبادیوں کے نمائندے صورتِ حال

پر غور کرنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں تمام براعظم کے نمایندے شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس ۱۷۷۴ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں ایک محضر نامہ تیار کرکے انگلستان بھیجا گیا جس میں اپنے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کا اعادہ کیا گیا تھا۔ ایک کمیٹی کی تشکیل بھی کی گئی جس کا کام یہ تھا کہ بائیکاٹ کی اسکیم پر ہر شخص سے عمل کرایا جائے۔ لیکن ان تمام کارروائیوں کا برطانوی حکام پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ برابر فوجی طاقت لا لاکر جمع کرتے رہے۔ سموئیل ایڈمز اور جان ہنکاک کو گرفتار کرلیا گیا کیونکہ اس بغاوت میں یہی لیڈر پیش پیش تھے۔

۱۷۷۵ء میں کچھ امریکی برطانوی فوج کے ایک دستے کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ فوج نے انھیں گرفتار کرنا چاہا لیکن چونکہ دلوں میں آگ لگی ہوئی تھی لہذا دونوں فریقوں نے اپنی اپنی بندوقیں سیدھی کرلیں۔ خوب دلوں کے حوصلے نکلے۔ قصہ مختصر آٹھ امریکی کام آئے۔ اس واقعہ سے اس عظیم انقلاب کی ابتداء ہوئی جس کا لاوا مدتوں سے پک رہا تھا۔ اس کے بعد دو چار جگہ اور اسی طرح کی جھڑپیں ہوئیں جن میں برطانوی افواج کو سخت جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ایک صبح ایسی بھی آئی جب بوسٹن کی برطانوی فوجوں کو معلوم ہوا کہ سولہ ہزار امریکی سپاہیوں نے ان کا محاصرہ کر رکھا ہے۔

امریکی عوام نے اس انقلاب کی شروعات کی خبر کو ملے جلے جذبات

کے ساتھ سنا۔ کچھ تو خوش تھے کہ یہ جنگ چھڑ گئی اور اب وہ برطانوی لعنت کے طوق کو اُتار پھینکیں گے۔ اور کچھ ایسے تھے جو برطانوی طاقت سے خائف تھے اس وجہ سے تشدد آمیز کارروائیوں کے حق میں نہ تھے۔ وہ کسی پُر امن تصفیہ کے خواہاں تھے۔ ۱۰ مئی ۱۷۷۵ء کو فلاڈلفیا میں دوسری عظیم کانفرنس ہوئی جس میں طے پایا کہ شاہ جارج سے امن کی بحالی کے لئے درخواست کی جائے۔ لیکن وہ خود جانتے تھے کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور اب جنگ کے علاوہ چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ فوجی اقدام کرنے کے لئے ایک ٹھوس منصوبہ مرتب کر لیا گیا اور جارج واشنگٹن کو کمانڈر انچیف کے عہدہ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ برطانیہ نے اس کانفرنس کی درخواست کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ فوجی طاقت کو بڑھانے کے لئے مزید بیس ہزار جوان جرمنی سے مانگ لئے۔

اسی اثناء میں امریکی سپاہ نے کوہِ بنکر پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایسے آڑے بیٹھے کہ برطانیہ کا سارا گولہ بارود وہیں بیٹھے بیٹھے ختم کرا دیا۔ امریکنوں کی ایک جماعت نے کناڈا پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی البتہ جنوبی کیرولینا اور ورجینیا وغیرہ میں برطانیہ کی فوجوں کو عبرت ناک شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ وضاحت ایک دفعہ پھر کر دینی چاہئے کہ جذبات اتنے بھڑک جانے کے باوجود نوآباد امریکیوں کی اکثریت اب تک مکمل آزادی کے حق میں نہیں تھی۔ وہ اس لڑائی کا مقصد صرف یہ سمجھتے تھے کہ انھیں دیگر

برطانوی باشندوں کی برابری کا درجہ مل جائے گا اور بس۔ امریکی افواج کے کمانڈر انچیف واشنگٹن نے بوسٹن میں خود یہی بیان دیا تھا لیکن جنگ جب ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۱ء تک کھنچ گئی تو لوگوں کا خیال بدلتا گیا۔ چند سرپھرے ایسے بھی تھے جو شروع ہی سے مکمل آزادی کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان مصائب سے بے خبر تھے جو آزادی کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ یہ مشکلات قدم قدم پر آئیں لیکن مکمل آزادی کا نظریہ آہستہ آہستہ پھیلتا ہی چلا گیا اور برطانیہ سے وفاداری کے جذبات ختم ہوتے چلے گئے۔

مکمل آزادی کا سب سے پُرجوش حامی تھامس پین تھا جو ۱۷۷۴ء میں فیلڈلیفیا میں آکر آباد ہوا تھا۔ یہ بڑے پائے کا مصنف تھا اور بادشاہی نظام حکومت کا پاگل پن کی حد تک مخالف۔ اس نے کئی باغیانہ پمفلٹ شائع کئے اور رائے عامہ کو بڑی حد تک آزادی کے حق میں ہموار کیا۔ ایک پمفلٹ اُس نے جنوری ۱۷۷۶ء میں "عام سمجھ بوجھ" کے نام سے شائع کیا۔ اس پمفلٹ نے تو جذبات میں بس آگ ہی لگادی اور جنگ ایک دم بھڑک اُٹھی۔ صلح یا سمجھوتے کی تمام اُمیدیں ختم ہوگئیں اور عوامی کانگریس نے پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کردی کہ وہ منشور آزادی تیار کرے۔ اس کمیٹی میں بنجمن فرینکلن بھی شامل تھا۔ آخر ۴ر جولائی ۱۷۷۶ء کو مکمل آزادی کا منشور شائع کردیا گیا۔ امریکہ کی تاریخ میں یہی دن آزادی کا جنم دن سمجھا جاتا ہے۔

اس منشورِ آزادی میں صاف صاف الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا کہ نوآباد اپنے مادرِ وطن (انگلستان) سے قطع تعلق کیوں کرنا چاہتے ہیں اس کے ساتھ ہی امریکہ کے سیاسی موقف کی بھی وضاحت کردی گئی۔ اس میں بتایا گیا کہ تمام انسان برابر پیدا کئے گئے ہیں اور پیدا کرنے والے نے سب کو چند حقوق دیئے ہیں جن میں کوئی دخل انداز نہیں ہوسکتا۔ زندگی آزادی اور خوش حالی کے لئے جدوجہد بھی ایسے ہی حقوق میں شامل ہے اور جب حکومت ان حقوق کو پامال کرنا شروع کردے تو لوگوں کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں یا اسے بالکل ہی ختم کرکے ایسی حکومت بنادیں جو ان کے حقوق کی اچھی طرح حفاظت کرسکے۔ اس منشور میں جمہوریت کے متعلق انھیں خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جو بہت قدیم زمانے سے یورپ میں چلے آرہے تھے یعنی یہ کہ حکومت عوام کی خادم ہو نہ کہ آقا۔ اس منشور نے آمریت پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی آواز آج تک لوگوں کے کانوں میں گونج رہی ہے اور جب تک تمام دنیا آزادی حاصل نہ کرلے گونجتی رہے گی۔

انگلستان سے تمام رشتے ختم کردینے کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ قائم ہوئی اور اس نئی قوم کو اپنی زندگی کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ جارج واشنگٹن جیسے آزمودہ کار، بہادر اور بے مثال لیڈر نے ان حالات پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ یہ واشنگٹن ہی تھا جس نے بوسٹن سے گیارہ ہزار کی برطانوی فوجی جمعیت کو اُکھاڑ کر پھینکدیا۔

لیکن برطانوی افواج نے جرمنوں کی مدد لے کر پھر حملہ کیا اور اس دفعہ امریکیوں کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ عوامی کانگریس اپنی فوجوں کو پوری کمک اس لئے نہ پہنچا سکی کہ جو تیرہ ریاستیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ کہلاتی تھیں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ متحد نہیں تھیں۔ دوسرے یہ کہ مالی حالت بھی خراب تھی اور روپیہ حاصل کرنے کے لئے ٹیکس لگاتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں لوگ ناراض نہ ہو جائیں۔ لیکن واشنگٹن نے جرأت مندانہ فوجی قابلیت کا ثبوت دیا کہ ۱۷۷۶ء کے کرسمس کی رات کو برطانوی سپاہ پر جو شراب میں دھت ہو رہے تھے شبخون مارا اور انھیں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بھگدڑ پڑ گئی۔ یہ حملہ ایسا کامیاب ہوا کہ برطانیہ کی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔

برطانوی پھر سنبھلے اور نیو یارک میں اپنی طاقت جمع کر کے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھے اور فیلاڈلفیا تک گھستے چلے آئے۔ امریکیوں کو پسپا ہونا پڑا اور دارالسلطنت فیلاڈلفیا کے جنگلوں میں پناہ لینی پڑی جہاں سردی اور خوراک کی کمی کے باعث سخت مصیبتوں کا سامنا ہوا برطانیہ نے امریکہ کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہی کر دیا ہوتا مگر اتفاق سے برطانوی فوجوں کا کمانڈر جنرل ہو کسی خاص سمجھ بوجھ کا آدمی نہ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی سیاسی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ تھیں۔ واشنگٹن نے اس کا فائدہ اُٹھایا اور سارٹوگا (نیو یارک) پر ڈٹ کر مقابلہ کیا دراصل یہی مقابلہ فیصلہ کن جنگ کہا جا سکتا ہے اس میں برطانیہ

کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔

برطانیہ نے جب یہ محسوس کیا کہ اس طرح جنگ میں انھیں کامیابی مشکل ہے تو انھیں وہی فرانس والی چال سوجھی کہ نیویارک پر حملہ کرکے امریکہ کو دو حصّوں میں بانٹ دیا جائے تاکہ ان کی طاقت منتشر ہوجائے۔ چنانچہ نیویارک پر تین طرف سے پوری طاقت کے ساتھ حملہ کیا۔ لیکن یہ حملہ بُری طرح ناکام ہوا اور امریکیوں نے تقریباً چھ ہزار برطانوی فوج کو گھیر کر خوب مار لگائی اور انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ اس پسپائی سے برطانیہ کے وقار کو سخت دھکا لگا۔ دشمن کا دشمن دوست کے مصداق فرانس اور اسپین بھی امریکیوں کے ساتھ مل گئے اور بنجمن فرینکلن نے شاہ فرانس سے بات کی کہ اگر فرانس اور امریکہ مل کر انگلستان کا مقابلہ کریں تو یقیناً مار بھگائیں گے لیکن جب انگلستان کو اس کی بھنک پڑی تو وہ خود فرانس سے مفاہمت کے لئے تیار ہوگیا مگر فرانس نے برطانیہ کی کوششوں کو ٹھکرا کر فروری ۱۷۷۸ء میں امریکہ کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔ اس کے بعد اسپین اور ہالینڈ بھی امریکہ کے ساتھ شریک ہوگئے اور بحری امداد پیش کی۔ فرانس اسپین اور ہالینڈ اگرچہ انگلستان سے زک اُٹھائے ہوئے تھے لیکن ان کی امریکہ کے ساتھ مفاہمت اس دشمنی کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جب امریکہ کو کامیابی ہوگی تو ان کے وہ مقبوضات جو ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے انھیں واپس مل جائیں گے۔

ان معاہدوں کی وجہ سے امریکہ کو آدمی بھی ملے، رسد بھی پہنچی اور روپیہ بھی۔ سب سے بڑی مدد فرانس کے بحری بیڑے سے پہنچی جو امریکہ کی مدد کے لئے آیا۔ فرانسیسیوں نے برطانیہ کو دو بار انگلستان میں گھس گھس کر مارا اور چونکہ برطانیہ تین کے مقابلہ میں اکیلا تھا اس لئے ہر محاذ پر شکست کھانی پڑی۔

ایک امریکی جنرل آرنلڈ امریکہ کی تاریخ میں ضرور ایسا ہے جس نے اس جنگِ آزادی سے مُنہ موڑا۔ وہ اس لئے ناراض ہوگیا تھا کہ اس کی ترقی نہیں ہوئی تھی چنانچہ اُس نے دریائے ہڈسن کے ویسٹ پوائنٹ کو برطانیہ کے حوالے کردینے کی سازش کی لیکن عین موقع پر اس کا ایک خط پکڑا گیا۔ جیسے ہی آرنلڈ کو اطلاع ملی کہ اس کا خط پکڑا گیا وہ بھاگ کر برطانیہ کے پناہ میں چلا گیا اور ان کی فوج میں شامل ہوکر ورجینیا پر چڑھائی کی۔

۱۷۷۸ء کے اواخر میں جنگ کا زور شمالی حصہ کے بجائے جنوبی علاقوں میں بڑھا کیونکہ برطانوی سمجھتے تھے کہ جنوبی ریاستوں (کرولیناس اور جارجیا) میں اب بھی چند لوگ انگلستان کے حامی موجود ہیں لیکن ان کا اندازہ زیادہ صحیح نہیں نکلا اور ان ریاستوں میں سے صرف دو ہزار آدمی ایسے نکلے جنھوں نے برطانیہ کے جھنڈے تلے رہنا پسند کیا مگر اتنا ضرور ہوا کہ ان آدمیوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے امریکیوں کے ہاتھ سے دو بندرگاہیں نکل گئیں۔ اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی برطانوی فوجوں

کو شمال کی بہ نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن امریکیوں کی گوریلا جنگ سے ان کا ناک میں دم آگیا اور کئی محاذوں پر انھیں شکستیں بھی ہوئیں۔ خاص طور پر کرولیناس پر انھیں زبردست نقصان اُٹھانا پڑا اور وہ مجبور ہوئے کہ پھر شمال کے علاقے کا رُخ کریں۔

اس انقلاب کی آخری جنگ ۱۷۸۱ء میں ورجینیا میں جو جیمس ٹاؤن سے چند میل کے فاصلے پر ہے لڑی گئی جہاں جنرل کارنوالس اور امریکہ کا باغی آرنلڈ برطانوی کمک کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔ تین ہزار پانچ سو امریکی سپاہی پہلے ہی وہاں ڈٹے ہوئے تھے کہ واشنگٹن پانچ ہزار فرانسیسی اور دو ہزار امریکی اور لے کر پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ ایک فرانسیسی بحری بیڑہ بھی آ پہنچا۔ اس بیڑے نے کمال یہ کیا کہ کارنوالس کو جو کمک انگلستان سے آرہی تھی ان سب جہازوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ جب برطانوی افواج کا چاروں طرف سے محاصرہ ہوگیا تو کارنوالس نے گھبرا گھبرا کر حملے کئے لیکن انجام کار اسے اکتوبر ۱۷۸۱ء میں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

برطانیہ کی کمر ٹوٹ گئی اب انھوں نے ایک اور چال چلی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا اسی اثناء میں انگلستان کی وزارت بدل گئی۔ بنجمن فرینکلن اس وقت پیرس میں تھا اس کو اطلاع دی گئی کہ ہم (برطانیہ) مفاہمت کی بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اگرچہ انگلستان امریکہ کی شرائط ماننے کے لئے تیار تھا لیکن امریکہ اور فرانس میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے ان دونوں ملکوں میں

کوئی ایک ملک انگلستان سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا تھا جب تک دوسرا اس میں شریک نہ ہو۔

۱۷۸۲ء میں یہ بات پوری طرح منظرِ عام پر آگئی کہ حکومت فرانس اور اسپین نے امریکہ کا ساتھ صرف اپنے مطلب کے لئے دیا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ مقبوضہ علاقے انھیں واپس مل جائیں۔ چنانچہ حکومتِ فرانس نے کہا کہ جمہوریہ امریکہ کی حدود پھر سے قائم کی جائیں اور مغربی خطہ جو فرانسیسی فوجوں نے فتح کرکے امریکیوں کو دیا ہے وہ اسپین کے قبضہ میں دے دیا جائے۔

یہ سیاست بھی عجیب گُل کھلاتی ہے آج کے دوست کل دشمن بن جاتے ہیں اور جو دشمن ہیں وہ ایک ہی پلٹی میں دوست بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ انگلستان اور امریکہ کا ہوا۔ یہ دونوں آپس میں دشمن ضرور تھے مگر اس بات پر دونوں متفق تھے کہ امریکہ کی سرزمین پر فرانس یا اسپین کی سلطنت نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے دونوں نے ایک خفیہ معاہدہ کرلیا کہ امریکہ کی حدود بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے مسس سپی تک اور گریٹ نکلس سے فلورڈا تک رہیں گی۔ آخر ایک صلح نامے پر ۳ رستمبر ۱۷۸۳ء کو پیرس میں دستخط ہو گئے۔ جس کی رو سے جنگ کے ختم ہونے کا اعلان کردیا گیا۔ امریکہ کو وہ تمام مراعات حاصل ہوگئیں جو وہ چاہتا تھا۔ برطانیہ نے اس کی تمام شرطیں منظور کریں۔ جن لوگوں نے دورانِ جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دیا تھا ان کو حکومتِ

امریکہ نے گرفتار کر رکھا تھا۔ یہ سب رہا کر دیئے گئے اور ان کی ضبط شدہ زمین، جائداد اور روپیہ پیسہ واپس کر دیا گیا۔

اس جنگ نے مالی اعتبار سے امریکہ کا دیوالہ نکال دیا۔ حد یہ ہے کہ امریکی سپاہیوں کو وقت پر تنخواہ بھی نہ مل سکی لیکن واشنگٹن نے بڑے تدبر سے تمام فوج کو سمجھا دیا اور فوجی تنظیم توڑ کر انھیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دے دی۔

یہ آزادی اور فتح اپنے ساتھ دسیوں قسم کے گھریلو جھگڑے بھی ساتھ لائی جن پر امریکیوں نے قومی مفاد کی خاطر بڑی عقلمندی سے قابو پالیا۔

چوتھا باب

جمہوریت کا انعقاد

امریکی انقلاب پر تقریباً دو صدیاں گذرجانے کے باوجود بھی یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ انقلاب کے فوراً بعد ایک مضبوط اور مرکزی حکومت کیوں نہیں قائم کی گئی جو امن و خوشحالی کو بحال کرتی اور تجارت و صنعت کو فروغ دیتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امریکہ کی تمام ریاستیں اگرچہ متحد ہوگئی تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو فرداً فرداً بجائے خود ایک ملک سمجھتی تھیں اور انہیں بدگمانیوں میں مبتلا تھیں جن میں آپ آج مغربی یورپ کو مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح آج ان حکومتوں کو مل کر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا ہے کچھ اسی قسم کے خیالات اس وقت امریکہ کی ریاستوں میں بھی تھے حالانکہ وہ سب برطانیہ کی زبردست طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس وقت متحد ہوگئی تھیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اتحاد جیسا کچھ بھی تھا بہرحال اتحاد تھا اور عوامی کانگریس مرکزی حکومت کا کام سنبھالے ہوئے بھی تھی لیکن ان تیرہ ریاستوں کا انتظام کوئی آسان بات تو نہ تھی۔ بہرحال روپے کی ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ کوئی تحریری قانون یا دستور ایسا نہ تھا جو اپنی بات منوانے اور ملک کی بہبودی کے لئے اسکیمیں بناکر ان پر عمل کرنے میں کانگریس کی مدد کرتا۔ اتحادی منشور کے مسودے میں اس سلسلے میں کچھ اختیارات کانگریس کو دیئے تو گئے تھے لیکن وہ ۱۷۷۶ء کے ہنگامی حالات کا دور تھا اور اب وہ حالات ختم ہوچکے تھے۔ علاوہ بریں جو کچھ اختیارات تھے بھی وہ بہت ناکافی تھے اور ان میں ترمیم اس لئے آسان نہ تھی کہ اس کے لئے ہر ریاست کا متفق ہونا ضروری تھا۔ اگرچہ دوسرے قوانین میں ترمیم کرنے کے لئے تیرہ میں سے صرف نو ووٹ کافی ہوتے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ ہر ریاست کا قطع نظر اس کی آبادی اور رقبے کے صرف ایک ووٹ تھا۔

کانگریس صلح بھی کرسکتی تھی اور جنگ بھی۔ دوسرے ملکوں کے سفراء بلا بھی سکتی تھی اور اپنے سفیر دوسرے ملکوں میں بھیج بھی سکتی تھی لیکن ملک کے اندرونی نظام میں دخل دینے اور اس کو بہتر بنانے کے لئے کانگریس کے پاس نہ تو انتظامیہ ادارہ تھا اور نہ اختیارات۔ یہاں تک کہ امریکہ کے کسی بھی شہری کو کسی قسم کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے مجبور نہ کرسکتی تھی۔ اور اگر کوئی

شہری کانگریس کا حکم نہ مانے تو کانگریس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس کے پاس کوئی طاقت ایسی نہیں تھی کہ وہ حکم عدولی کرنے والے کو کسی عدالت کے سامنے کھڑا کر کے سزا دلوا سکے۔ ان حالات میں وہ لوگ جو امریکہ میں انقلاب کے بعد ایک قومی اور مرکزی حکومت بنانے کے منصوبے بنائے بیٹھے تھے عجب شش و پنج میں پڑ گئے اور کوئی راہ ان سے نجات پانے کی نہ سوجھتی تھی۔ کیونکہ اتحاد کے منشور میں ہر ریاست کو آزاد اور خود مختار تسلیم کیا گیا تھا اور اس سہو پر اس لئے کسی نے اس وقت توجہ نہ دی کیونکہ ان حالات میں ریاستوں کا اتحاد بہت ضروری تھا۔

ان غیر اطمینان بخش حالات نے ملک پر ایک جمود سا طاری کر دیا ہر شخص اپنی جگہ تذبذب میں تھا کہ اب ملک کے سیاسی نظام کا کیا ہوگا۔ ریاستیں خود مختار ہی رہیں گی یا قومی حکومت کے ماتحت ہوں گی۔ اس غیر یقینی عرصے میں کانگریس نے البتہ ایک کامیابی ضرور حاصل کی۔ مغربی علاقے کو مرکز کے ماتحت لے کر اس پر ایک گورنر اور تین جج حاکم مقرر کر دیئے۔ عام مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا اور تعلیم بالکل مفت کر دی۔ اس کے علاوہ زر خرید غلاموں کا طریقہ بالکل ختم کر دیا اور اس طرح عوام کے سامنے ایک ڈھانچہ پیش کیا کہ لوگ اندازہ لگا سکیں کہ مرکز کے ماتحت حکومت کیسی ہو سکتی ہے اور وہ عوام کی بہبودی کے لئے کتنی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

اس اثنار میں میسیچوسٹس کے باشندوں نے قومی حکومت بنانے پر زور دینا شروع کردیا اور ان کے اس مطالبے نے ایسا زور پکڑا کہ اچھی خاصی بغاوت کی صورت پیدا ہوگئی۔ اگرچہ یہ بغاوت دبادی گئی لیکن اس نے عوام کو چونکا ضرور دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جمود میں حرارت پیدا ہوئی اور عوام نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

واشنگٹن جیسے مدبر نے پہلے ہی اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور اپنے ایک گشتی مراسلے میں تمام گورنروں کو لکھا تھا کہ ملک کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کا اقتدار اعلیٰ کہیں نہ کہیں مرکوز ہو ورنہ ریاستوں کا یہ اتحاد زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ جب حالات سدھرنے میں دیر لگی تو کانگریس اور متحدہ حکومت میں لوگوں کی دلچسپیاں کم ہوگئیں یہاں تک کہ اکثر متحدہ حکومت کے اجلاس کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کرنے پڑتے تھے۔ اتفاق سے میری لینڈ اور ورجینیا میں ایک تجارتی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے لوگوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک موقع مل گیا اور بین الریاستی اتحاد کی ضرورت اور واضح ہوگئی۔ فریقین کے نمائندوں کو واشنگٹن کے مکان پر مدعو کیا گیا اور وہاں یہ بات کھلی کہ اس جھگڑے سے صرف یہ دو ریاستیں ہی متعلق نہیں ہیں بلکہ دوسری بھی ہیں۔ لہذا ساری ریاستوں کے

نمایندوں کا ایک اجلاس طلب کیا گیا تاکہ اس قضئے کا مناسب تصفیہ کیا جائے لیکن صرف پانچ ریاستوں نے یہ دعوت نامہ منظور کیا۔ ان پانچ ریاستوں کے نمایندوں میں الیگزینڈر ہملٹن بھی تھا جو نیویارک کی طرف سے آیا تھا۔ ہملٹن نے انقلاب کے دوران واشنگٹن کے ساتھ کام کیا تھا اور بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ وہ ایک مضبوط مرکزی حکومت کا پُرجوش حامی تھا۔ اس نے کہا کہ اگلے سال یعنی ۱۷۸۷ء میں پھر تمام ریاستوں کو مدعو کیا جائے اور صرف تجارتی حالات پر ہی نہیں بلکہ پورے سیاسی مستقبل پر غور کیا جائے۔ کانگریس نے یہ تجویز منظور کرلی اور دعوت نامے جاری کر دیئے۔ اس دفعہ ایک کے علاوہ باقی سب نے لبیک کہا۔ میٹنگ اسی ہال میں رکھی گئی جہاں ٹھیک گیارہ برس پہلے منشور آزادی منظور کیا گیا تھا اور صدارت کے لئے جارج واشنگٹن جیسے محبِ وطن کو منتخب کرکے تمام ممبران بنجمن فرینکلن اور الیگزینڈر ہملٹن جیسے ایثار پیشہ اور جادو بیان مقرروں کے خیالات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوکر بیٹھ گئے۔ اگرچہ سب ممبران یہ سوچ کر بیٹھے تھے کہ ہمیں آیندہ کی حکومت کے لئے کوئی قطعی فیصلہ کرکے اُٹھنا ہے لیکن جیسا کہ ہر میٹنگ میں ہوتا ہے چند ممبروں نے قدرے اختلاف بھی کیا۔ اس پر واشنگٹن نے دھواں دھار تقریر کی اور کہا "یہ یقیناً ہوسکتا ہے کہ جو تجاویز یہاں پیش کی جائیں وہ بالکل ہی رد کردی جائیں مگر یہ یاد رکھئے کہ اس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ ملک پھر ایک خوفناک کشمکش میں پھنس جائے۔ یہاں

بیٹھ کر اگر ہم چند افراد کو خوش کرنے کے لئے وہی چیزیں پاس کر دیں جن کو ہم خود ہی مناسب نہیں سمجھتے تو غور کیجئے کہ ہم عوام کی گرفت سے اپنے آپ کو کس طرح بچا سکیں گے۔ لہذا ہم کیوں نہ ایک ایسی معیاری چیز کو لے کر چلیں جس پر ہر دیانت دار اور ذی ہوش انسان متفق ہو جائے۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے"۔ واشنگٹن کے ان الفاظ نے تمام نمائندوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ چنانچہ اب متذکرۂ بالا مقاصد کے لئے تجاویز پیش ہوئیں اور ممبران نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ نیوجرسی اور ورجینیا کے نمایندوں نے دو ترمیمیں پیش کیں۔ ورجینیا کی ترمیم یہ تھی کہ قومی حکومت قائم کی جائے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی شعبۂ انتظامیہ (ایگزیکیٹو۔ شعبہ قانون ساز (لیجسلیچر) اور شعبہ عدل و انصاف (جوڈیشیل) نیز یہ کہ قانون ساز شعبے کے مزید دو حصے ہوں۔ ایک دارالخواص (سینٹ) ہو اور دوسرا دارالعوام (ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو) ترمیم میں یہ بھی تصریح کی گئی کہ دارالخواص میں صرف ریاستوں کے نمایندے لئے جائیں اور ہر ریاست کو نمایندگی دیتے وقت اُس کے رقبے اور آمدنی کو پیش نظر رکھا جائے اور دارالعوام میں صرف وہ لوگ رکھے جائیں جن کو ریاست کے عوام انتخاب کر کے بھیجیں۔ ورجینیا کی ترمیم میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ریاستوں میں قانون ساز شعبے ختم کر دیئے جائیں اور تمام ریاستیں مکمل طور پر مرکز کے ماتحت ہوں۔ مرکز کثرتِ

رائے سے جو قانون چاہے پاس کرے۔ ریاستیں دخل انداز نہ ہوں بلکہ ان کے لئے مرکز کے ہر قانون کا ماننا لازمی قرار دیا جائے۔

نیوجرسی چونکہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی اس لئے اس کے نمایندے کو ڈر ہوا کہ اگر کہیں ورجینیا کی تجویز پاس ہوگئی تو نیوجرسی جیسی چھوٹی موٹی ریاستیں تو لبھاؤ میں ہی ختم ہو جائیں گی چنانچہ اس نے اپنی ترمیم بہت محتاط الفاظ میں پیش کی۔ اس نے تجویز کیا کہ شعبۂ قانون ساز کو دو حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے اور یہ کہ ہر ریاست کو برابر کی نمایندگی دی جائے جیسا کہ اتحادی منشور میں کہا گیا تھا۔ نیوجرسی کے نمایندے نے ورجینیا کے نمایندے سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں تمام ریاستوں پر کنٹرول کرنے کی حمایت کی۔

ان دو اہم ترمیمات کے علاوہ اور بھی بہت اہم معاملات زیر بحث آئے اور کئی ہفتوں کی مسلسل بحث و تمحیص کے بعد ارکانِ جلسہ نے کانگریس کے اقتدار اعلیٰ پر صاد کیا اور ورجینیا کے مشورے کے مطابق شعبۂ قانون ساز کے دو حصے ہی منظور کئے گئے لیکن نیوجرسی کی ترمیم کو منظور کرتے ہوئے ہر ریاست کو برابر کا حق نمایندگی دیا گیا یعنی یہ کہ آمدنی، رقبہ اور آبادی دارالخواص میں کسی ریاست کے نمایندے مقرر کرنے کے لئے زیر غور نہیں لائے جائیں گے بلکہ ہر ریاست کو دو نمایندے بھیجنے کا حق دیا گیا۔ دارالعوام کے لئے بھی ورجینیا کی مجوزہ ترمیم منظور ہوگئی لیکن اس میں اتنی تبدیلی اور کردی گئی کہ ہر ریاست کے نمایندوں

کی تعداد اس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے۔ اور وہ نمایندے عوام براہ راست منتخب کریں۔ ان کے علاوہ نہ اور کوئی خاص ترمیم آئی اور نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔ ایک ایک مسئلے کو اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد وہ دستور جو پہلے کئی سال سے وجود میں آنے کا منتظر تھا آخر مکمل ہو ہی گیا اور مکمل ہوتے ہی تمام ریاستوں پر اس کی زد پڑی کیونکہ دستور میں اصل حاکم تو عوام ہی تسلیم کئے گئے تھے اور مرکز کے قانون کو ریاست کے لئے لازمی طور پر قابلِ عمل ٹھیرایا گیا تھا۔

اس دستور کے منظور ہوتے ہی قانون بنا دیا گیا کہ کوئی ریاست نہ کسی کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکتی ہے اور نہ کسی سے صلح کرنے کی مجاز ہے۔ نہ سکّہ ڈھال سکتی ہے اور نہ کوئی ٹیکس عاید کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دستور کی دفعات کے مطابق مرکزی حکومت نے تمام ریاستوں کو یقین دلایا کہ مرکزی حکومت ان کے تمام مفادات کی مناسب حفاظت کرے گی اور عوامی جمہوری حکومت قائم کرنے اور انھیں بیرونی حملوں سے بچانے کی ذمّہ دار ہوگی۔ آپ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ ریاستیں مرکز کی غلام ہو گئیں۔ انھیں اتنے ہی اختیارات حاصل تھے جتنے ایک عوامی جمہوریہ میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں ان کے نمایندے موجود تھے اور وہ کسی بھی معاملے میں اکثریت کی رائے کو ہموار کر کے اپنی بات منوا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ریاستوں کی اپنی اپنی حدود میں لوگوں کی عام فلاح وبہبود کے اور اندرونی مسائل کے حل کرنے کے تمام

اختیارات ریاستوں کے پاس ہی تھے اور لوگوں کی جان ومال کی حفاظت اب بھی ان ہی کے ذمے تھی۔ تجارت اور بنکوں پر ریاست ہی کا قبضہ تھا۔ تعلیم اور شادی بیاہ غرضیکہ سیکڑوں چیزیں ایسی تھیں جن سے مرکز کا تعلق برائے نام ہی تھا ورنہ اصل اختیار ریاستوں ہی کو حاصل تھا۔

اس دستور کو فیڈرل کانسٹی ٹیوشن کا نام دیا گیا اور اس کے ماتحت جو قومی اور مرکزی حکومت بنی اس کے وہی تین شعبے ایگزیکٹیو، لیجسلیچر اور جوڈیشیل علیحدہ علیحدہ رکھے گئے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن کچھ اختیارات ایسے بھی محفوظ رکھے گئے کہ یہ شعبے باوجود تمام اختیارات کے اپنی مجوزہ حدود سے باہر نہ جا سکیں اور یہ اس لئے کیا گیا کہ جمہوریت کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ چند معاملات ایسے بھی تھے جن میں مرکز کو دخل دینے کا حق نہ تھا مثلاً حبس بیجا کی درخواست مرکز کے اثر و رسوخ سے باہر تھی (حبس بیجا کی درخواست پولیس کے خلاف دی جاتی ہے کہ سائل کی گرفتاری کے لئے پہلے پولیس عدالت سے منظوری حاصل کرے) اسی طرح کانگریس (پارلیمنٹ) کوئی ایسا قانون پاس کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی جس میں بغیر مقدمہ چلائے نظربندی کی اجازت دی جائے یا کسی ایسے کام کا مواخذہ کیا جائے جو کسی قانون کے پاس ہونے سے پہلے کیا گیا ہو۔ کانگریس اس بات کی پابند تھی کہ ہر ریاست کی بندرگاہ کو یکساں اہمیت دے۔ خطابات اور اعزازات دینا بھی کانگریس کے دائرۂ

اختیار سے باہر تھا۔

دارالخواص (سینٹ) کے ممبران کی مدّت ممبری چھ سال تجویز ہوئی اور دارالعوام کے ممبروں کی دو سال رکھی گئی۔ دارالخواص کے ایک تہائی ممبروں کو ہر دو سال کے بعد ریٹائر کر دینا اس وجہ سے مناسب خیال کیا گیا تاکہ جمہوریت کی حکومت میں کوئی ممبر اپنی کرسی کو اپنی میراث نہ سمجھنے لگے اور جمہوریت کی روح صحیح معنوں میں قائم رہے۔

جو قوانین پارلیمنٹ پاس کرتی تھی ان کا رائج کرنا شعبۂ انتظامیہ کے سپرد تھا۔ یہ شعبہ وہی ٹیکس وصول کرتا تھا جو پارلیمنٹ پاس کر دیتی۔ اسی مقدار میں سکّہ رائج کر سکتا اور بنک چلا سکتا تھا جتنے کی پارلیمنٹ اجازت دیتی تھی۔ مختصر یہ کہ شعبۂ انتظامیہ قوانین کو چلانے کی مشین تھا اور اس شعبہ کا افسر اعلیٰ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا خود صدر ہوتا تھا۔ صدر قوانین پر ایمانداری سے عمل کرانے کا ذمہ دار تھا۔ صدارت کی مدّت صرف چار سال مقرر کی گئی تھی۔ اس کی مدد کے لئے ایک نائب صدر بھی مقرر کیا جاتا تھا جو سینٹ کے اجلاس کی صدارت بھی کرتا تھا اور دوسرے انتظامی امور کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ صدر کا ہاتھ بٹانے کے لئے مختلف محکمے مختلف آدمیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے جو اس محکمے کے سکریٹری کہلاتے تھے۔

صدر پارلیمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں تھا بلکہ اسے کافی اختیارات حاصل تھے۔ صدر کی منظوری اور دستخطوں کے بغیر پارلیمنٹ کسی

قانون کو نافذ نہیں کر سکتی تھی۔ صدر کو اختیار تھا کہ وہ کسی قانون کو رد کر دے یا دوبارہ غور کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے پاس واپس بھیجدے۔ لیکن دوبارہ غور کرتے وقت اگر پارلیمنٹ کے دو تہائی ممبروں کی حمایت اس قانون کو حاصل ہوجاتی تھی تو وہ بغیر صدر کے دستخطوں کے ہی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم صدر کا حق تنسیخ حکومت کے تینوں اہم شعبوں میں توازن قائم رکھتا تھا اور حکومت کی طاقت کو تینوں شعبوں میں برابر برابر تقسیم کرتا تھا۔

برّی اور بحری بیڑے کی کمان بھی صدر کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اُس کو اختیار ہوتا تھا کہ جس ملک سے چاہے معاہدہ کرے لیکن اُس کے لئے ضروری تھا کہ سینٹ کے دو تہائی ووٹ اس کے حق میں ہوں۔ اسی طرح سینٹ کی منظوری سے وہ سپریم کورٹ کے ججوں، سفیروں اور دوسرے اعلیٰ افسروں کا تقرر کر سکتا تھا اور بر وقتِ ضرورت پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کر سکتا تھا لیکن اگر صدر رشوت، سازش یا کسی اور بڑے جُرم کا مرتکب پایا جائے تو پارلیمنٹ کو بھی یہ حق پہنچتا تھا کہ صدر کو برخاست کر دے۔

دستور بنانے والے جب صدر کے فرائض مقرر کر رہے تھے تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا صدر حکومت کا برائے نام سربراہ نہیں ہوگا بلکہ حقیقی معنوں میں صدرِ حکومت ہوگا۔ عوام کا سب سے بڑا نمایندہ ہوگا اور اپنی رہنمائی سے عوام کو متحد کرے گا۔ چنانچہ صدر کے

انتخاب کا طریقہ ہی ایسا انوکھا مقرر کیا گیا کہ صرف وہی شخص اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہو سکے جو عوام کا محبوب ترین نمائندہ ہو۔ طریقہ یہ رکھا گیا کہ ہر ریاست اپنے عوام سے ایک جماعت منتخب کرے اور ان منتخب ہونے والوں کی تعداد اس ریاست کے ان نمائندوں کی تعداد کے برابر ہو جو پارلیمنٹ کے دونوں حصّوں میں اس ریاست کی طرف سے بھیجے گئے ہوں اس طرح ساری ریاستوں کے منتخب کئے ہوئے لوگ مل کر ایک صدر کا انتخاب کریں۔ اگر کسی قانونی الجھن کی وجہ سے یا کافی ووٹ حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے صدر منتخب نہ کیا جا سکے تو دارالعوام کو انتخاب کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ دستور بنانے والوں کے دماغ میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر صدر پارلیمنٹ کا منتخب شدہ ہوگا تو وہ لازمی طور پر پارلیمنٹ کا مرہونِ منّت ہوگا اور آزادیٔ رائے سے کام نہ کر سکے گا۔ اسی لئے صدر کے انتخاب کا حلقہ جداگانہ مقرر کیا گیا۔ پہلے پہل تو انتخاب کرنے والوں نے اپنی مرضی کے امیدوار کا انتخاب کیا۔ لیکن بعد میں سیاسی پارٹیوں کا دباؤ بڑھتا گیا اور صدر کا انتخاب کرنے والے سیاسی لیڈروں کے کہنے پر چلنے لگے۔

حکومت کا تیسرا شعبہ عدل و انصاف تھا جس کے ماتحت بمعہ سپریم کورٹ تمام عدالتیں ہوتی تھیں۔ سپریم کورٹ ملک کی آخری عدالت تھی جس میں بین الریاستی اور قومی مقدمات فیصل ہوتے تھے۔ اس عدالت کا فیصلہ آخری اور قطعی مانا جاتا تھا۔ ہر ریاست میں ایک

فیڈرل کورٹ قائم تھی۔ یہ عدالت مرکزی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں
کے مقدمات سنتی تھی اور اس عدالت کے فیصلے کی اپیل سپریم کورٹ میں کی
جاسکتی تھی۔ اگر کوئی قانون دستور کی منشاء کی نفی کرتا تھا تو اس قانون کو سپریم
کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر عدالت میں دعویٰ ثابت ہو جاتا تو
قانون کالعدم قرار دیا جاتا تھا۔ اس نظام سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں
کہ حکومت عوام کے حقوق کا کس قدر تحفظ چاہتی تھی۔ ہر امریکی یہ حق رکھتا
تھا کہ قانون کا سہارا لے کر حکومت کے بڑے سے بڑے فیصلے کو رد
کرادے۔ آگے چل کر فیڈرل کورٹ کے اختیارات بڑھا دیئے گئے اور
اب یہ عدالتیں قومی اور بین الاقوامی تمام مقدمات سننے لگیں ان کو حکومت
کے معاہدوں، سفیروں اور وزیروں کے خلاف مقدمات پر فیصلہ دینے
کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ ان عدالتوں کے باوجود ہر ریاست کی
مقامی عدالتوں میں مقدمات کی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔

دستور میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ جب حالات کا تقاضا ہو وقتاً
فوقتاً اس میں تبدیلی یا ترمیم کی جا سکے۔ پارلیمنٹ کو اُس میں ترمیں لانے
کا حق تھا بشرطیکہ پارلیمنٹ کے دونوں حصّوں کو ملا کر دو تہائی ووٹ
ترمیم کے حق میں آجائیں یا ریاستی اسمبلیوں کے دو تہائی ممبروں کی طرف
سے کوئی تحریری درخواست موصول ہو تو ترمیم پر غور کرنے کے لئے اجلاس
بلایا جا سکتا ہے لیکن وقت نے بتا دیا کہ دستور اتنا مکمل تھا کہ اس میں کسی
ترمیم کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ اس میں بہت سوچ سمجھکر الفاظ لکھے گئے

تھے اور ہر ہر لفظ بہت وسیع معنی رکھتا تھا۔

جب دستور پاس ہوا تو ہر ریاست کو اس کی نقل بھیجی گئی تاکہ ریاست اپنی اسمبلی سے اس کی باقاعدہ منظوری حاصل کرے۔ جیسے ہی مسودہ شائع ہوا لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور بعض بعض ریاستوں نے تو تصدیق کرنے میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ نکتہ چینیوں کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برخلاف ایسی ریاستیں بھی تھیں جنھوں نے اس پر جی بھر کے اعتراضات کئے۔ خاص طور پر میسیچوسٹس میں تو اس کے حق میں اتنے کم ووٹ آئے کہ گرجانے کا پورا خطرہ تھا مگر جان ہنکاک نے جو میسیچوسٹس کی اسمبلی کا صدر تھا پورے امریکہ کی نائب صدارت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس سے کچھ یوں ہی سا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا، دستور کی تصدیق میں بڑا سہارا دیا۔ مختصر یہ کہ ہر ریاست نے آخرکار تصدیق کر ہی دی۔ اگرچہ معترضین چلاتے ہی رہے کہ یہ دستور فریب ہے، چال ہے، دھوکا ہے بادشاہت کو دوبارہ لانے کی ترکیب ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دستور کی تصدیق ہوتے ہی ہر ریاست نے پہلا کام یہ کیا کہ صدارت کے انتخاب کے لئے منتخب کرنے والوں کی جماعت کو چنا۔ اور ان تمام چنے ہوئے نمایندوں نے بھاری اکثریت سے قوم کے سچے خادم اور عظیم رہنما جارج واشنگٹن کو اس عالی قدر منصب کے لئے منتخب کیا۔ نائب صدر میسیچوسٹس کے جان آدم چنے گئے اور عارضی طور پر شہر نیویارک کو مرکزی حکومت کا دارالسلطنت ہونے کی عزت بخشی گئی۔

امریکہ کے محبوب صدر نے امریکی دوستوں کی سلامیاں لیں اور جس راستہ سے عوام کا یہ محبوب رہنما گذرا لوگوں نے آنکھیں بچھائیں اور پھولوں سے لاد دیا۔ سارے ملک کا دورہ کرنے کے بعد جب واشنگٹن نیویارک پہنچا تو اتنا زبردست استقبال کیا گیا کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ ۱۷ر ستمبر ۱۷۸۷ء کو فلیڈلفیا میں واشنگٹن کے گھر میں دستور تیار ہوا تھا۔ اور آج ۳۰ر اپریل ۱۷۸۹ء کو اسی واشنگٹن نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مرکزی حکومت کی نشست کو پہلی بار بحیثیت صدر ملک کے خطاب کیا۔

پانچواں باب

واشنگٹن سے پولک تک

جارج واشنگٹن کو مسلسل دو مرتبہ صدر چنا گیا اور اُس نے اس عرصہ میں ملک اور قوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ عوام بھی اس سے محبت کرتے تھے اور دل سے اس کی تعریف کرتے تھے لیکن امریکہ کا سیاسی ڈھانچہ کچھ ایسا ہے کہ آج تک شاید دو چار صدر ہی ایسے گزرے ہوں گے جو کسی غیر معیّن عرصے تک لوگوں میں مقبول رہے ہوں۔ ہر ملک میں کوئی نہ کوئی جماعت ایسی ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھے آدمیوں پر اعتراض کرتی رہتی ہے اور ان کی غلطیاں اور کوتاہیاں اُچھالتی پھرتی ہے۔ چنانچہ امریکہ بھی اس عنصر سے پاک نہ تھا۔ اس جماعت نے واشنگٹن جیسے مخلص اور محبِّ وطن کو بھی نہ بخشا۔ جب تک لوگوں کی محبت جوش پر رہی تو ان لوگوں کی ہمّت نہ پڑی کہ واشنگٹن

کے خلاف ایک حرف بھی کہہ سکیں۔ لیکن دنیا میں کوئی جذبہ بھی ہمیشہ ہی جوش میں نہیں رہتا۔ اس میں کبھی نہ کبھی ضرور اعتدال آتا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں سرد مہری بھی کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب امریکہ کے عوام نے دوسری بار واشنگٹن کو صدر منتخب کیا تو اس کے تھوڑے ہی دن بعد عوام کی محبّت کا وہ اُبال اعتدال پر آگیا جو واشنگٹن کی کوئی کوتاہی یا لغزش سننے یا ماننے کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اب اس جماعت کو کام کرنے کا موقع ملا۔

واشنگٹن نے سیاسیات سے بلند رہ کر کام کرنے کی پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا لیکن امریکہ کے اتحاد اور سالمیّت کے متعلق اس کے خیالات میں کہیں بھی لچک نہ تھی۔ وہ امریکہ کو بند مٹھی کی طرح متحد دیکھنا چاہتا تھا اور اس لئے اس کا نظام اس سلسلے میں بہت سخت تھا۔ وہ اس اتحاد کی عمارت کی ایک اینٹ کو بھی ٹیڑھا ترچھا دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ بُرائیاں دیکھنے والوں نے یہی اس کا قصور ٹھیرایا اور پروپیگنڈا کیا کہ واشنگٹن تو آمرانہ نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو صدارت کے پردے میں ڈکٹیٹر بنا بیٹھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ امریکہ میں کچھ دماغ ایسے بھی تھے جنھوں نے دستور کی مخالفت کی تھی۔ ان دماغوں کو اس پارٹی کے پروپیگنڈے سے شہ ملی۔ اور مخالفین نے ایک سیاسی جماعت ری پبلکن پارٹی کے نام سے بنا ڈالی اتحاد کے حامی (جن کو لوگ فیڈرلسٹ کہتے تھے) اور ری پبلکن

پارٹی کا اختلاف شروع ہوگیا اور اس اختلاف کی بنیاد دستور نہیں تھا بلکہ طریقہ کار تھا۔ ری پبلکن لوگ یہ کہتے تھے کہ دستور تو اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اس کے الفاظ کو فیڈرلسٹ جو معنی پہناتے ہیں وہ غلط ہیں۔ فیڈرلسٹوں کا نظریہ یہ تھا کہ الفاظ کی بندش ذرا ڈھیلی ہونی چاہیئے تاکہ حکومت کو قانون بنانے اور نظام چلانے میں دشواری نہ ہو اور آزادی سے کام کرنے کی گنجایش ملے۔ اس کے برخلاف ری پبلکن پارٹی یہ کہتی تھی کہ دستور کے الفاظ آخری اور قطعی ہیں اور عمل انہیں کے مطابق ٹھیک ٹھیک ہونا چاہیئے۔ حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی کام کرے۔

واشنگٹن بہت دوربین آدمی تھا۔ وہ عوام کے ذہن کو اچھی طرح سمجھتا تھا اسے معلوم تھا کہ عوام کی محبت کا جوش کسی نہ کسی دن اعتدال پر آئے گا لہذا اُس نے اس کا پہلے ہی سے انتظام کرلیا تھا۔ اس نے پہلی صدارت کے زمانے میں ہی دو محکموں کے سکریٹری مخالف گروپ سے مقرر کرلئے تھے تاکہ مخالفت کرنے والوں کا منھ کسی قدر بند رہے۔ الیگزینڈر ہملٹن کو مالیات کا محکمہ دیا اور جیفرسن کو اُمور مملکت (اسٹیٹ) مگر ایک مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں اگرچہ سخت جمہوری مزاج کے تھے لیکن طبیعتوں میں اختلاف تھا اس وجہ سے قدم قدم پر ٹکراتے تھے اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ اگر ایک کھیت کی کہتا تو دوسرا کھلیان کی سناتا۔

حکومت کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ آیا کہ مال گذاری میں اضافہ کیونکر ہو تاکہ روپیہ آئے اور حکومت اپنی ساکھ قایم کرے اور انقلاب کے زمانے کے لئے ہوئے قرضوں کی ادائیگی کس طرح کی جائے۔ ہملٹن وہ شخص تھا جس نے صرف دو سال میں حکومت کے بجٹ کی خسارے کی مدیں ساری ہی ختم کردیں اور ایسے طریقے اختیار کئے جن سے عوام کو فائدہ ہی پہنچا۔ لیکن ری پبلکن خیال کے لوگوں نے ان کو بھی سیاسی تعصب کی عینک سے دیکھا اور یہ کام بھی بُرے معلوم ہوئے۔ غیر ملکی قرضے تمام ادا کردیئے تو کوئی نہ بولا لیکن جب امریکی عوام کے بانڈوں کا روپیہ ادا کیا تو شور مچ گیا کہ ہملٹن خزانہ خالی کئے دیتا ہے۔ ہملٹن مطمئن تھا کہ جو کچھ وہ کررہا ہے اس سے حکومت کی ساکھ بڑھے گی اور جن لوگوں نے انقلاب کے دنوں میں حکومت کے بانڈ خرید کر حکومت کی اس آڑے وقت میں مدد کی ہے ان کی ہمت افزائی ہوگی۔ اور کسی بھی ضرورت کے وقت حکومت کو روپیہ مل سکے گا۔ اس نیک مقصد پر احتجاج ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب لوگوں نے بانڈ خریدے تھے تو یہی سمجھ کر خریدے تھے کہ یہ صرف حکومت کی امداد ہے ان کو ادائیگی کی اُمید ہی نہ تھی اس لئے اکثر لوگوں نے تو وہ بانڈ احتیاط سے رکھے ہی نہ تھے اور جن چند کے پاس پڑے تھے اُن میں سے بھی بہتوں نے بہت معمولی معمولی رقم پر نفع اندوزوں کے ہاتھ بیچ دیئے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ ایسا ہے جیسے پڑا ملگیا۔

غرض یہ کہ اکثریت کسی نہ کسی طرح بانڈ کھو چکی تھی۔ لہٰذا اس ادائیگی پر اُنھیں صدمہ ہونا قدرتی بات تھی لیکن اُس نے صاف اعلان کردیا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ کو روپیہ مل رہا ہے یا نہیں میرے مدنظر تو صرف قومی حکومت کا وقار اور قومی فلاح ہے۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور آخر تمام قرضے بے باق کردیئے اس کا نتیجہ حقیقتاً ہملٹن کی اُمّید کے مطابق نکلا یعنی حکومت کا وقار اور اعتماد بحال ہوگیا۔ پبلک نے حکومت کے دوسرے بانڈوں پر روپیہ لگانا منظور کرلیا۔ ہملٹن کا ارادہ یہ بھی تھا کہ ریاستہائے متحدہ کے لئے ایک بینک کھولے اور اس کو بینک آف انگلینڈ کے طرز پر چلائے۔ چنانچہ جب یہ بینک کھلا تو اس سے ملک کی تجارت کو بڑی مدد ملی۔ سرکاری روپیہ جو لگانوں اور ٹیکسوں سے وصول ہوتا تھا اسی بینک میں جمع کیا جاتا تھا گویا یہ بنک سرکاری خزانہ تھا۔ ملکی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے اس بنک کو کاغذی سکّہ جاری کرنے کی بھی اجازت دیدی۔ دولت میں مزید اضافے کے لئے درآمد کے مال پر اور شراب پر ٹیکس لگادیا جس سے آمدنی میں خاصی ترقی ہوئی لیکن ان ٹیکسوں اور بنک کے اجراء سے لوگوں میں کافی ناراضگی پھیلی۔ یہاں تک پنسلوینیا جو شراب کا گھر تھا بغاوت پر اُتر آیا۔ اگرچہ یہ بغاوت فوجی طاقت سے دبا دی گئی لیکن تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئی۔ اس کو "وہسکی کی بغاوت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

درآمد کے ٹیکس پر شمالی خطے کے لوگ تو بہت خوش تھے کیونکہ وہاں جوتے، کپڑے اور مشینوں کے کارخانے کھل رہے تھے اور لوگ یہ چاہتے تھے کہ درآمد پر کوئی پابندی عائد ہو تاکہ ان کے بنائے ہوئے مال کی کھپت کے لئے میدان صاف ہو لیکن جنوبی حصّہ کے بسنے والے زیادہ تر زراعت پیشہ تھے اور روئی وغیرہ دساور بھیجکر بنا ہوا مال اس کے بدلے میں لے لیتے تھے اور جب اس تیار مال پر انھیں درآمد کا ٹیکس دینا پڑا تو وہ بھڑک گئے اور نہ صرف حکومت سے ناراض ہو گئے۔ بلکہ شمالی علاقوں کے لوگوں سے بھی انھیں دشمنی پیدا ہو گئی کیونکہ وہ اس ٹیکس کے حامی تھے۔ اس دشمنی کا اثر اگرچہ فوری طور پر کچھ نہیں نکلا لیکن یہ برابر دلوں میں کھٹکتی رہی اور آخرکار تقریباً ستر برس بعد خانہ جنگی کی صورت میں پھوٹ پڑی۔ اس طرح شمالی اور جنوبی باشندوں نے ایک دوسرے کے خلاف اپنے دلوں کا غبار نکالا۔

بیان کردہ اندرونی نزاعات کے علاوہ حکومت کی خارجہ پالیسی سے بھی ری پبلکن پارٹی کو اختلاف تھا۔ اس اختلاف کی بنا یوں پڑی کہ جب واشنگٹن نے حکومت کا کاروبار سنبھالا تو فرانس میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہ اس قدر خوفناک بغاوت تھی کہ نہ صرف یورپ کے حکمراں اپنی خیر منا رہے تھے بلکہ امریکہ کی نوزائیدہ آزادی اور جمہوریت بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تباہی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ یورپ کے حاکموں نے جب آگ کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھا

تو بغاوت کو دبانے کی کوشش کی لیکن فرانسیسی امریکہ کے معاملے میں پہلے ہی دن سے خار کھائے بیٹھے تھے انھیں موقع غنیمت معلوم ہوا ________ ________. چنانچہ انھوں نے لگے ہاتھ انھیں بھی سنگوانا شروع کر دیا۔ پچھلے صفحات میں ہم فرانس اور امریکہ کے معاہدے کا ذکر کر چکے ہیں وہ معاہدہ ابھی تک برقرار تھا اور اس لئے فرانسیسیوں کو امّید تھی کہ امریکہ انگریزوں کے خلاف ان کی ہی مدد کرے گا اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیونکہ فرانس نے ہماری ایسے آڑے وقت میں مدد کی تھی جب ہم جنگِ آزادی لڑ رہے تھے لیکن امریکیوں کا طرزِ عمل قدرے بدلا ہوا تھا۔ وہ فرانس کی ترقی کو اپنی آزادی کے لئے بھی کوئی نیک فال نہ سمجھتے تھے اس لئے ان کے خیالات زیادہ ہموار نہ تھے۔ واشنگٹن نے اس صورتِ حال کا جائزہ لے کر ۱۷۹۳ء میں یہ اعلان کر دیا کہ ہمارا معاہدہ فرانس کے سابق حکمراں شہنشاہ لوئیس سے تھا جو قتل ہو چکا۔ فرانس کے باغیوں سے ہمارا کوئی معاہدہ نہیں اس لئے ہم اس بغاوت میں قطعی غیر جانب دار ہیں اور رہیں گے۔ اس اعلان کے باوجود بھی فرانس نے ایک خاص سفیر بھیجکر امریکہ کو جنگ میں کود پڑنے کو کہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ برطانوی تجارتی جہازوں کو تباہ کرنے کے لئے امریکی بندرگاہوں کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے اور یہ کہ اسپین اس وقت برطانیہ کا ساتھ دے رہا ہے لہذا امریکہ میں اس کی جتنی مقبوضات ہیں سب چھین لی جائیں۔ اگر وہ عقلمندی سے کام لیتا تو یہ عین ممکن تھا کہ عوام اس

کے مذکورہ مطالبات ماننے پر رضامند ہوجاتے لیکن اس نے بے وقوفی یہ کی کہ امریکہ میں جو لوگ فرانس کے حامی تھے ان سے کھلے عام ملنا جلنا شروع کر دیا کہ وہ حکومت پر زور ڈلوا کر غیر جانبداری کے اعلان کو منسوخ کرادیں اس کی اس غیر دانش مندانہ پالیسی نے فرانس کے لئے رہی سہی ہمدردیاں بھی کھو دیں اور آخر اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

شمالی مغربی علاقوں میں برطانیہ کا چند قلعوں پر قبضہ تھا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جب تک امریکہ کے تاجر انگلستان کے باشندوں کا وہ قرض نہیں چکا دیتے جو انھوں نے نوآبادیاتی زمانے میں لیا تھا اس وقت تک ان قلعوں کو وہ امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے اس کے ساتھ ہی امریکی آبادیوں کے خلاف ہندوستانیوں کو بھی اُکساتے رہتے تھے اور اس ترکیب میں تھے کہ جو زمین مغربی حصے میں ان کے ہاتھ سے نکل گئی ہے وہ پھر ہاتھ آجائے امریکہ کے تجارتی جہازوں کو بھی برطانوی بیڑہ اکثر روک لیا کرتا تھا اور اس کے ملاحوں کو یہ کہہ کر گرفتار کرلیا کرتا تھا کہ وہ برطانوی فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی ہیں۔

واشنگٹن ان تمام واقعات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور جب وہ دوبارہ صدر منتخب ہو کر آیا تو اُس نے کوئی آخری قدم اُٹھانے سے پہلے یہ مناسب سمجھا کہ ایک دفعہ کوشش کی جائے کہ یہ معاملات صلح صفائی سے حل ہوجائیں چنانچہ ۱۷۹۴ء میں اُس نے ایک سفیر کو بات چیت کرنے کے لئے لندن بھیجا۔ برطانیہ نے قلعے خالی کردینے کا وعدہ کرلیا

بشرطیکہ انھیں تجارت اور جہاز رانی وغیرہ کی سہولتیں دیدی جائیں۔ یہ جواب امریکی عوام کو بہت ناگوار گزرا لیکن واشنگٹن نے خاموشی میں بہتری سمجھی۔

ہم نے آپ کے سامنے حالات کا جو مختصر خاکہ پیش کیا ہے اس سے یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ واشنگٹن جیسے محبوب رہنما کو امریکی عوام نے صدارت کے لئے مزید منتخب کیوں نہیں کیا۔ سنہ ۱۷۹۶ء میں واشنگٹن صدارت سے سبکدوش ہوا اور جمہوریت کے اس ہیرو نے جو الوداعی تقریر کی اس میں ایک ایسی نصیحت کی جو آج تک امریکہ کے کام آرہی ہے۔ اس نے کہا "کندھے سے کندھا ملاکر کام کرو اور دنیا کے کسی ملک سے مستقل دوستی کے معاہدے نہ کرو" واشنگٹن کے بعد جان آدم صدارت کے لئے منتخب ہوا۔ وہ بھی بڑا پکا فیڈرلسٹ تھا لیکن نائب صدر حزبِ مخالف کا سرگرم رکن تھامس جیفرسن چناگیا۔

اسی اثنار میں فرانس کی بغاوت مزید زور پکڑ گئی اور وہ امریکہ سے اس قدر ناراض ہوگئے کہ جب نئے صدر نے اپنے سفیر کو پیرس بھیجا تو وہاں اس سے کسی نے بات نہ کی۔ اس تناؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس اور امریکہ کے بحری بیڑے آپس میں لڑ پڑے لیکن صدر نے اس نامناسب جنگ کو پوری طاقت سے دبادیا۔ جب یہ چھیڑ چھاڑ چل رہی تھی تو فیڈرلسٹ پارٹی نے دو قانون پاس کرائے۔ پارٹی کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے پاس ہونے کے بعد مخالفین دب جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی دو قانون فیڈرلسٹ

پارٹی کی موت کا باعث ہوئے۔ ایک قانون تو معاہدوں کے متعلق تھا کہ صدر کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ جس معاہدے کو امریکہ کے مفاد کے خلاف سمجھے منسوخ کردے۔ دوسرا قانون حکومت کے وقار کے متعلق تھا کہ اگر کوئی حکومت کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرے یا جھوٹی افواہیں اڑائے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ پہلا تو لاگو نہیں کیا گیا لیکن دوسرے کے تحت ری پبلکن اخبارات کے کچھ ایڈیٹر ضرور جیل بھیجدیئے گئے کیونکہ وہ شروع ہی سے فیڈرلسٹ نظامِ حکومت پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے اور بڑی کھری کھری سناتے تھے۔ ری پبلکن پارٹی نے ان دونوں قانونوں کو ہی ناجائز قرار دیا اور کہا کہ یہ دونوں دستور کی دی ہوئی تحریر و تقریر کی آزادی کے منافی ہیں۔ جیفرسن کے ایما پر دو ریاستوں کی اسمبلیوں نے بھی ان کے خلاف قرارداد پاس کرکے ان کی منسوخی کا مطالبہ کردیا۔ قصہ مختصر ۱۸۰۵ء میں نئی حکومت بنانی پڑی اور اس مرتبہ جیفرسن صدر منتخب ہوکر آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیفرسن نے کرسئ صدارت سنبھالتے ہی اصلاحات کی طرف ایسی تیزی سے قدم بڑھایا کہ عوام دنگ رہ گئے۔ حکومت کے اخراجات میں حیرت انگیز کمی کردی۔ وہسکی پر ٹیکس معاف کردیا۔ حکومت کے خلاف آواز نکالنے کے جرم میں جو لوگ قید کئے گئے تھے انھیں آزاد کردیا۔ بحرِ روم کے بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے ایک نہایت مضبوط بیڑا روانہ کیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ تعجب عوام کو اُس وقت ہوا جب جیفرسن نے دستور کے الفاظ کو ایسے معنیٰ پہنانے شروع کئے جو کبھی فیڈرلسٹوں

کے خیال میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ حالانکہ صدارت سے پہلے جیفرسن دستور کے الفاظ کی سخت پابندی پر زور دیتا تھا اور اُن میں ذرا سی بھی لچک پسند نہ کر سکتا تھا۔ جیفرسن کی اس نئی کروٹ نے عوام کو عجب اُلجھن میں ڈالدیا۔

جیفرسن کا دوسرا بڑا اقدام یہ تھا کہ بغیر پارلیمنٹ کی اجازت یا دستوری اختیار کے لوئی سینیا کا علاقہ خرید ڈالا۔ یہ علاقہ دریائے مسسپی کے مغرب میں پھیلا ہوا تھا اور زمین سخت پتھریلی تھی۔ ۱۷۶۳ء میں اُس کو فرانس نے اسپین کے حوالے کر دیا تھا لیکن اب ۱۸۰۰ء میں فرانس کے حکمراں نپولین بوناپارٹ نے اسپین سے اپنے علاقے کا مطالبہ کر دیا تھا کیونکہ فاتح نپولین نئی دنیا کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ ریاستہائے متحدہ کی خوش قسمتی تھی کہ جب نپولین ویسٹ انڈیز میں اُلجھا ہوا تھا تو اُسے سخت فوجی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اُس نے امریکہ کے متعلق اپنا ارادہ بدل دیا۔

جیفرسن نے اپنے سفیر پیرس بھیجے کہ فرانس کی حکومت سے فرانسیسی مقبوضات کے خریدنے کی بات چیت کریں۔ چنانچہ فلورڈا اور نیو اورلین کا ڈیڑھ کروڑ ڈالر میں سودا ہوا اور لوئی سینیا اس سودے میں شامل سمجھا گیا کیونکہ اصل میں تو یہ فرانس کی ملکیت تھا۔ یہ علاقے اتنے وسیع تھے کہ ان کے مل جانے سے امریکہ کی حکومت کا رقبہ تقریباً دوگنا ہو گیا اور دریائے مسسپی کے منبع سے دہانے تک امریکہ کا ملک ہو گیا۔ اس طرح مغربی سرحدی علاقے کے متعلق غیر ملکی قبضہ کا سوال ہی ختم ہو گیا۔

موقع سے فائدہ اُٹھانا جیفرسن خوب جانتا تھا چنانچہ علاقہ خریدتے ہی اُس نے ایک آزمودہ کار دستے کی حفاظت میں اس علاقے کا سروے کرنے کے لئے ایک پارٹی روانہ کردی۔ اس پارٹی میں اس کا پرائیویٹ سکرٹیری بھی شامل تھا۔

امریکی عوام اگرچہ اس کے اس اقدام پر ناراض نہیں تھے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ دستور میں کہیں کوئی ایسی اجازت نہیں تھی جس کے تحت صدر اپنے اختیار سے ایسی خرید و فروخت کرسکتا۔ دستور میں دوسرے ممالک سے معاہدات کرنے کی تو اجازت تھی لیکن جیفرسن کا خیال تھا کہ زمین کی خرید بھی اس اجازت کے ماتحت آجاتی ہے۔ یہ تھی دستور کے الفاظ کی کھینچا تانی جس سے عوام کو تعجب ہوتا تھا۔

اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یوں پیدا ہوئی کہ انگلینڈ اور فرانس کی ٹھنی ہوئی تو تھی ہی اس میں جو ذرا تیزی آئی تو دونوں نے ایک دوسرے کی ناکہ بندی کردی اور اعلان کردیا کہ غیر جانبدار ملکوں کے جہاز دونوں کے ساحلوں سے دُور رہیں۔ اس ناکہ بندی کا امریکہ پر بہت بُرا اثر پڑا کیونکہ یہاں تو تجارت ہی در اصل انگلینڈ سے ہوتی تھی۔ سیکڑوں جہاز غلّہ اور خام اشیاء لے جاتے ہوئے دونوں فریقوں میں سے ایک نہ ایک نے گرفتار کرلئے تھے۔ جیفرسن نے اس خطرے کے وقت کو ٹلانے کے خیال سے پارلیمنٹ کو مشورہ دیا کہ بیرونی تجارت بالکل بند کردی جائے اور تمام جہازوں کو حکم دیا جائے کہ اپنی بندرگاہ پر رہیں۔ پارلیمنٹ نے

۱۸۰۷ء میں یہ حکم جاری کردیا۔ ایسا حکم دستور کی منشاء کے قطعی خلاف تھا۔ دستور میں یہ تو تھا کہ پارلیمنٹ تجارت کو قاعدے میں رکھے گی۔ یا ترتیب دے گی۔ لیکن باقاعدہ بنانے یا ترتیب دینے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ تجارت کو بالکل ہی ختم کردیا جائے۔ ہر شخص اس حکم پر بے چین تھا اور خاص طور پر تاجر اور کاشتکار۔ جب بہت چیخ و پکار ہوئی تو دو سال کے بعد اس کو واپس لے لیا گیا اور اس کی جگہ اسی مقصد کا لیکن ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں ایک اور حکم آگیا کہ اگر برطانیہ اور فرانس میں سے کوئی امریکی جہازوں کے حقوق ملنے کے لئے تیار ہو تو امریکہ اس ملک کے ساتھ پھر تجارت شروع کردے گا۔ اس اعلان کے آتے ہی فرانس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور امریکہ کے تجارتی تعلقات انگلستان سے ٹوٹ کر فرانس سے بندھ گئے۔ ان تمام واقعات کا اثر پھر انتخاب پر پڑا۔ اور ۱۸۰۹ء میں جیفرسن کی جگہ مادی سن صدارت کے لئے منتخب ہوا

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پچھلے تینوں صدر امریکہ کے حق میں بہترین منتظم اور محب وطن ثابت ہوئے۔ انھوں نے حکومت کو ایسے ڈھنگ سے چلایا کہ ملک جنگ کے شعلوں سے بچتا ہوا ترقی کی راہ پر بڑھتا ہی چلا گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قدرتی طاقت ان کی پشت پر تھی کہ ان کے ہر کام کو عوام کی بھلائی اور ملک کی خوشحالی کی طرف موڑ دیتی تھی۔ آنے والے صدر مادیسن نے اگرچہ بہت کوشش کی لیکن وہ نیک روایات جو سابقہ صدر چھوڑ گئے تھے قائم نہ رہ سکیں۔

انگلستان نے امریکہ کے ساتھ یوں تو بہت بُرا سلوک کیا لیکن آزادی کے بعد یہ اُمید تھی کہ ان کا رویہ بدل جائے گا مگر اس کے برعکس برطانیہ کا سلوک امریکہ کے ساتھ اس قدر خراب ہوگیا کہ امریکہ کے لوگوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی کہ برطانیہ سے جنگ کرکے ایک دفعہ اس دردِ سر کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے اور امریکہ کے اُبھرتے ہوئے جوشیلے جوان منتظر تھے کہ کب موقع ملے کہ کینیڈا پر امریکہ کا جھنڈا بلند کردیں۔ آخر ۱۸۱۲ء میں امریکی عوام کے جذبات سے متاثر ہوکر پارلیمنٹ کو برطانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کرہی دینا پڑا۔ جب جنگ چھڑ گئی تو نقشہ ہی بدل گیا اور یہ جنگ بڑی حد تک بیکار ثابت ہوئی۔ خاص طور پر نیو انگلینڈ نے اس کی بڑی مخالفت کی اور یہاں تک دھمکی دی کہ اگر یہ جنگ نہ روکی گئی تو نیو انگلینڈ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے الگ ہوجائے گا۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں اس جنگ کی پوری طرح حمایت نہیں کی گئی اس لئے جنگ کا تعلق عوام سے نہیں بلکہ ایک خاص جنگ باز طبقے سے رہ گیا اور وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی صلح کرنی پڑی۔

اس جنگ کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ محاذ جنگ بہت لمبا تھا اور اس کو کنٹرول کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے علاوہ امریکی سپاہیوں کے پاس وہی پرانے ہتھیار تھے جب کہ انگریز جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ امریکیوں کو کئی جگہ پیچھے ہٹنا پڑا۔ ۱۸۱۴ء میں برطانوی فوجوں نے واشنگٹن شہر پر حملہ کیا اور چونکہ امریکیوں میں تازہ شکستوں

کا احساس موجود تھا اس لئے بڑی آسانی سے اس پر قبضہ کرلیا۔ وہائٹ ہاؤس، کیپٹل اور دوسری سرکاری عمارات کو آگ لگا دی لیکن برطانوی فوجیں بالٹیمور کی طرف بڑھیں تو وہاں امریکیوں نے جم کر مقابلہ کیا اور دشمن پر خاصی بمباری کی۔ اسی پر جوش مقابلے سے متاثر ہوکر فرانسس سکارٹ نے قومی ترانہ لکھا "ستاروں کا ہمسر یہ پرچم"

اس جنگ کی سب سے بڑی کامیابی امریکہ کو اس دن حاصل ہوئی جس دن صلح نامے پر دستخط ہوئے لیکن جتنے عرصے میں صلح کی بات چیت ہوئی انگریزوں نے نپولین سے نمٹ کر ایک دستہ نیو اورلین پر حملہ کرنے کے لئے امریکہ روانہ کردیا تھا۔ یہ دستہ جب امریکہ پہنچا تو صلحنامے پر دستخط ہوچکے تھے لیکن پھر بھی مسسپی کی وادی میں سرحدی چوکیوں پر اس دستے سے کافی جھڑپیں ہوئیں اور امریکیوں نے اس دستے کو کسی قیمت پر آگے نہ بڑھنے دیا۔

اس صلح کے بعد انگریزوں نے امریکہ کے جو تجارتی جہاز روک لئے تھے وہ واپس کردیئے اور پہلے کی طرح امریکیوں کو تنگ کرنے اور ستانے کا جو ایک طریقہ بنا رکھا تھا وہ بھی بند کردیا۔ اس کے علاوہ یہ صلح کچھ اور نشانات بھی چھوڑ گئی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس صلح سے تمام ریاستوں کے ضمیر پر ایک چوٹ پڑی اور اس کے بعد سب کی سب اس طرح متحد ہوگئیں کہ یہ اتحاد آج تک قائم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ری پبلکن پارٹی جو اس وقت

برسرِ اقتدار تھی یہ سمجھ گئی کہ حکومت کا نظام سختی کے ساتھ ہی چل سکتا ہے جیسے فیڈرلسٹ چلاتے تھے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جان مارشل کے فیصلوں نے بھی قومی ضمیر کو جگانے میں بڑی مدد دی ہے۔ جان مارشل فیڈرلسٹ خیال کا ایک پرانا سیاست داں تھا اور جان آدم کی صدارت کے دور میں سنہ ۱۸۰۱ء میں اس عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک اس دستور کو چیلنج کرنے کے ان گنت مقدمات آئے اور جہاں کہیں اس نے دیکھا کہ دستور کے خلاف حکومت نے کوئی قدم اُٹھایا ہے اس نے برملا حکومت کے خلاف فیصلہ دے کر حکومت کو اس کے غلط اقدام سے باخبر کردیا۔ چنانچہ امریکہ میں آج بھی سپریم کورٹ کی جو اہمیت ہے اور جتنا وسیع اختیار ہے وہ دنیا کے لئے ایک مثال ہے۔

ملک کو متحد کرنے میں ذرائع آمدورفت نے بھی بڑا عمدہ پارٹ ادا کیا ہے۔ اسٹیمر کی ایجاد نے امریکہ کی تجارت پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ نہ صرف یہ کہ بیرونی تجارت چمک اُٹھی بلکہ اندرونی تجارت میں بھی جان پڑگئی اور جو دریا جہازرانی کے قابل تھا اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا گیا مثلاً دریائے مسی سپی اور اس کی شاخوں میں خوب جہاز چلنے اور ہزاروں من مال دن بھر میں اِدھر سے اُدھر کردیتے سنہ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ ریل میں ترقی ہونی شروع ہوئی۔ جوں جوں ریلوں کا سلسلہ بڑھتا گیا بین الریاستی تجارت اور تعلقات

میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان ترقیوں کی بدولت نئی بستیاں اور نئے شہر نمودار ہوئے۔ کارخانے کھلے اور عوام کے تعلقات میں زیادہ قربت اور ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔

غرضیکہ اگر مندرجہ بالا حقائق پر نظر رکھی جائے تو بلاشبہ ۱۸۱۲ء کی جنگ امریکہ کے لئے ایک نیک فال ثابت ہوئی اور اگرچہ فوجی طور پر دب کر صلح نامہ کرنے سے اس وقت وقار کو ضرور ٹھیس لگی تھی لیکن ایسی ٹھیس مبارک ہے جو ترقیوں کے دروازے کھول دے اور قومی حمیت کو بیدار کر دے۔

۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۴ء تک آٹھ سال کا عرصہ امریکہ میں "بہترین احساس کا زمانہ" کہلاتا ہے کیونکہ اس دور میں امریکی قوم نے پوری طرح قومیت کا احساس کیا اور اسی احساس نے قومی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی طرف رہنمائی کی۔ خاص طور پر معاشی ترقی نے تو قوم میں جان ڈال دی۔ اس زمانے نے جیمس منرو کو صدارت کی کرسی پر بیٹھے دیکھا اور اس کی سخت خارجہ پالیسی کو بھی دیکھا ہے۔ فیڈرلسٹ پارٹی کی سیاسی موت بھی دیکھی ہے اور ری پبلکنوں کا عروج بھی دیکھا۔ امریکہ میں اسپین کو اپنے مقبوضات سے ہاتھ دھوتے بھی دیکھا ہے۔ کیونکہ جب نپولین کی جنگ ختم ہوئی تو اسپین اندرونی طور پر اس قدر کھوکھلا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے مقبوضات کے عوام میں آزادی کے بڑھتے ہوئے جذبات کو نہ روک سکا۔ اندرونی طور پر گڑبڑ ہوتی رہی اور لوگ قاعدے

قانون سے ہٹتے گئے یہاں تک کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سرحدوں پر حملے ہونے شروع ہوگئے اور اسپین یہ سب کچھ دیکھتا رہا کیونکہ اس کے پاس طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ لیکن امریکہ اپنی سرحدوں پر حملے کیسے برداشت کرلیتا۔ صدر منرو نے جیکسن کی کمان میں فوج دے کر فلورڈا کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھیجدیا اور یہ اختیار دے دیا کہ تم مناسب سمجھو تو حملہ آور ہندوستانیوں کا ان کی سرحدوں میں گھس کر تعاقب بھی کرسکتے ہو (اسپین کی مقبوضات میں زیادہ تر ہندوستانی ہی آباد تھے) جیکسن نے اس اجازت کی شہ پاکر دو ایک حملوں میں ہی ۱۸۱۸ء میں سارا علاقہ زیر کرلیا اور بیچارہ اسپین ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ جب اسپین نے دیکھ لیا کہ بچا کھچا حصہ بھی کچھ دنوں میں جاتا رہے گا تو اس نے اپنی خوشی سے ۵ لاکھ ڈالر میں امریکہ کے ہاتھ بیچ دیا۔

اب دنیا کی دوسری قوموں کو بھی امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس ہوا اور دراصل اسی زمانے میں امریکہ بطور ایک جیتے جاگتے ملک کے دنیا کے نقشے پر اُبھرنا شروع ہوا اور دنیا مجبور ہوگئی کہ دنیوی مسائل پر سوچتے وقت امریکہ کو نظر انداز نہ کرے لیکن دنیا کے چند ملک جان بوجھ کر ان حقائق سے نظریں بچانا چاہتے تھے اور اب بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ دو چار مل کر امریکہ کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کی بنا پر فرانس، آسٹریا، پروشیا اور روس نے آپس میں گٹھ جوڑ کیا اور اس کا نام ہولی الائینس (مذہبی اتحاد) رکھا اور یہ شہرت دی کہ جو علاقے

نپولین کی جنگ میں یورپ کی طاقتوں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں یہ سب مل کر وہ علاقے انھیں واپس دلائیں گے۔ اسپین نے سوچا کہ میں بھی ان کے ساتھ مل جاؤں تو شاید امریکہ میں میرے علاقے مجھے واپس مل جائیں لہذا یہ بھی اس گٹھ جوڑ میں شریک ہوگیا اور یاروں نے یہ سوچ کر وعدہ بھی کرلیا کہ لڈو ٹوٹے گا تو بورا ضرور جھڑے گا۔ ہم اس کے علاقے واپس دلوائیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور اپنے حصے میں بھی آئے گا۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ فرانس کی آنکھیں تو پہلے ہی میکسیکو پر لگ رہی تھیں اب کیلیفورنیا کو دیکھ دیکھ کر روس کے منہ میں بھی پانی آنا شروع ہوگیا تھا، لیکن امریکی اب ایک زندہ قوم تھے انھوں نے فوراً ان کی ترچھی نگاہوں کو بھانپ لیا اور وہ سمجھ گئے کہ یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں چاروں طرف سے انھیں گھیر کر مارنا چاہتی ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس سازش میں انگلستان شریک نہیں ہوا کیونکہ اُس وقت امریکہ سے اس کی تجارت سونا اُگل رہی تھی اور وہ یہ تجارت نہ تو کسی اور ملک کو منتقل کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ جنگ میں پھنس کر اس کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ لہذا برطانوی وزیر مسٹر کیننگ نے امریکہ کو پیشکش کی کہ وہ انگلستان کے ساتھ مل جائے اور دوستی کا معاہدہ کرکے یورپ کی طاقتوں کو یہ بتادے کہ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہ کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی طمانیت کے لئے یہ بھی معاہدہ کرلیں کہ دونوں میں سے کوئی ملک بھی شمالی اور جنوبی امریکہ میں اپنے رقبے میں اضافہ کرنے

کی نہیں سوچے گا۔ اس پیشکش پر امریکہ کے عوام نے یہ سوچ کر اظہار رضامندی کردیا کہ ایک تو پُرانا دشمن دوست بنتا ہے۔ دوسرے برطانیہ کی بحری طاقت وقتِ ضرورت اپنے کام بھی آئے گی۔ لیکن امریکہ کے چند اونچے سیاستدانوں نے اس معاہدے کی مخالفت کی۔ اس وقت کوئنسی سکریٹری آف اسٹیٹ تھا اس نے بھی مخالفت کی اور کہا کہ اس معاہدہ کے ذریعے برطانیہ امریکہ کو اطالوی مقبوضات اور جنوبی امریکہ سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ علیحدگی اس وقت تو مناسب ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ کے حالات بدل جائیں۔ اس لئے ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم کسی معاہدے میں شریک نہ ہوں اور آخر صدر منرو نے کوئنسی کی بات مان کر ۱۸۲۳ء میں اپنی پارلیمنٹ کو پیغام دیا کہ یورپ کو خبردار کردیا جائے کہ وہ امریکہ میں مزید بستیاں بسانے کی کوشش نہ کرے اور نہ اس آزاد قوم کے معاملات میں دخل دے۔ دیکھی آپ نے اس زندہ قوم کی جرأت؟

منرو کے اصول نے امریکہ کو علیحدگی پسندی کا ایک راستہ دکھایا تھا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ اپنا بچاؤ کیا جائے یعنی یہ کہ تم کسی پر حملہ نہ کرو بلکہ اپنی حفاظت کرو کہ تم پر کوئی حملہ نہ کرے۔ اگرچہ آج اس اصول کے الفاظ و معانی بدل گئے ہیں لیکن روح نہیں بدلی۔ اس صدی میں دو جنگیں ہوئیں اور ان دونوں جنگوں میں امریکی سپاہیوں نے دنیا کے دور دراز ملکوں میں جاکر مصیبت زدہ ملکوں کی مدد کی اور کوشش کی کہ جنگ کے شعلے دب جائیں تاکہ یہ امریکہ تک نہ پہنچ سکیں۔

جب منرو کی صدارت کا زمانہ ختم ہوا تو اس کے ساتھ ہی وہ احساس کا زمانہ بھی ختم ہوگیا اور قومی بیداری اور یکجہتی کی سطح کے نیچے جو خود غرضانہ مقاصد کے بلبلے چھپے ہوئے تھے منرو کے ہٹتے ہی ظاہر ہوگئے۔ سنہ ۱۸۲۴ء کے الیکشن میں ری پبلکن پارٹی نے صدارت کے لئے اکٹھے چار امیدوار کھڑے کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت کے ووٹ کوئی بھی نہ لے سکا۔ ہنری کلے البتہ بہت معمولی ووٹوں سے جیتا۔ کلے نے اپنی صدارت کے چار سال یوں ہی غیر تعمیری کاموں میں کھودیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس عرصے میں جیکسن (جس نے اسپین کے مقبوضات فتح کئے تھے) نے ایک مضبوط سیاسی پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے بنالی اور سنہ ۱۸۲۸ء کے الیکشن میں صدارتی انتخاب کے لئے کھڑا ہوا اور اس بھاری اکثریت سے انتخاب جیتا کہ مخالفین کی صفیں اُلٹ دیں۔ صدارت سنبھالنے کے بعد جیکسن نے اپنی شہرت کی لاج رکھ لی اور مثالی خدمات انجام دیں اس نے وہی کچھ کیا جو عوام چاہتے تھے اور جو اکثریت کا ذہن تھا۔ اس کے بدخواہ اس کو شاہ اینڈریو اول کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ وہ جو کچھ کرتا تھا پورے عزم اور قوت کے ساتھ کرتا تھا۔ مزدور، چھوٹے تاجر اور کاشتکاروں کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت ایسی نہ تھی جو اس کے حق میں ہو۔

جنوبی علاقے کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جیکسن ان کے ساتھ ہے اس لئے سنہ ۱۸۳۰ء میں درآمد برآمد کے قانون پر انھوں نے کچھ گڑبڑ کی۔ لیکن جیکسن نے انھیں بہت سخت جواب دیدیا اور جیفرسن کی یوم پیدائش

کی تقریب کے موقع پر جو تقریر کی اس میں اشارۃً کہدیا کہ ملک کا اتحاد بہرحال بحال رہنا ہی چاہئے اس کے باوجود ریاست کرولینا نے اس قانون کو کالعدم قرار دینے کے لئے قدم اُٹھانا چاہا مگر جیکسن نے کہدیا کہ اگر اس قسم کی حرکت کی گئی تو ریاست پر چالیس ہزار سپاہی چڑھا دے گا۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ ٹھنڈے پڑ گئے۔ بعد میں ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے لئے جیکسن نے درآمد برآمد کے ٹیکس کی شرح قدرے کم کر دی۔

شمالی مشرق کے باشندے جیکسن کی پالیسی سے خوش تھے لیکن جو رویہ اس نے قومی بنک کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا وہ پسندیدہ نہیں تھا اس بنک میں حکومت اور ملک کے اونچے تاجروں کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اور یہ تاجر پارلیمنٹ کے ممبروں کو قرضے وغیرہ دلوا کر انھیں اپنے اثر میں رکھتے تھے جیکسن کو یہ پالیسی پسند نہ تھی۔ اس لئے اُس نے پارلیمنٹ کو بنک کے اثر سے نجات دلانے کے لئے بنک کی اہمیت اس طرح ختم کر دی کہ حکومت کا تمام روپیہ بنک سے نکلوا لیا حالانکہ یہ دستور کے خلاف تھا اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مارشل نے بھی اپنے فیصلے میں ایک دفعہ بنک کو دستور کے مطابق قرار دیا تھا چنانچہ اس کے اس اقدام پر احتجاج ہوئے لیکن اس نے کسی کی پروا نہ کی اور ملک کا روپیہ ریاستوں کے بنکوں کو منتقل کر دیا۔ ریاستوں کے بنکوں نے کاغذی سکّہ بے اندازہ چھاپ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نفع اندوزی کے خیال سے زمینیں خریدنی شروع کر دیں۔ اس کا علاج جیکسن نے یہ کیا کہ حکم دے دیا کہ سرکاری خزانے میں زمین کی جو قیمت

داخل کی جائے وہ سونے اور چاندی کی شکل میں ہونی چاہئے۔ نوٹ نہیں لئے جائیں گے۔

غرضیکہ جیکسن حکومت پر اس طرح چھا گیا کہ ساری حکومت اسی کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گئی اور جب اس کی جگہ مارٹن وان برن صدر منتخب ہوا تو حکومت کا اقتصادی ڈھانچہ ڈانواڈول ہو گیا۔ سونا چاندی ظاہر ہے کہ کاغذی سکّے کے برابر نہیں تھا اس لئے لوگوں نے زمین کا لین دین بالکل ہی بند کر دیا۔ بنک فیل ہو گئے اور ہزاروں آدمی بیکار ہو گئے۔ تاریخ میں اسے "سنہ ۱۸۳۷ء کی ہولناکی" کہا جاتا ہے۔ اڑی دھڑی قاضی کے سر پڑی کے مصداق یہ سارا الزام برن پر آیا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں پھر انتخاب ہوا اس میں جیکسن اور برن کے مخالفین نے مل کر ایک پارٹی بنا لی اور اس کا نام وہگ رکھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی اس الیکشن میں ہار گئی اور وہگ پارٹی کا ولیم ہنری ہیریسن کامیاب ہوا۔

منرو، آدم اور جیکسن کے زمانۂ صدارت میں مغرب کے باشندوں کی آبادی میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی اور لوسینیا کے شمال مغرب میں جو علاقہ پڑا تھا اس میں بستیوں پر بستیاں آباد ہوتی چلی گئیں۔ آبادی کی اس ترقی سے مشرقی خطّے کے لوگوں کو اور خاص طور پر نیو انگلینڈ والوں کو ڈر ہوا کہ اس طرح ان کا اثر کانگریس (پارلیمنٹ) سے ختم ہو جائے گا اور اپنی آبادی کے لحاظ سے مغرب کے لوگ جن کے مفاد مشرق سے بالکل مختلف ہیں کانگریس میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ اور ان کا یہ خوف

حق بجانب بھی تھا کیونکہ ۱۸۲۰ء میں سینٹ کے چھیالیس ممبروں میں سولہ مغرب کے نمائندے تھے۔ اور اب آبادی کا اندازہ یہ تھا کہ ۱۸۰۳ء میں جس اوہیو کی آبادی کل پچاس ہزار تھی ۱۸۲۰ء میں وہی آبادی چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح انڈیانا کی آبادی ایک لاکھ سینتالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ لہذا مغرب نے سیاست میں ابھرنا شروع کیا اور ان کی توجہ غلامی کے مسئلے پر مبذول ہوئی۔ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ ہر سمجھدار امریکی کے دماغ میں موجود تھا۔ وقت کا یہ ایک اہم سوال تھا کہ کیا یہ لوگ اس قدر غیر جمہوری ہیں کہ ان کی ریاستیں اور آبادیاں نہیں قائم کی جاسکتیں۔ اس سلسلہ میں جنوب والوں نے پہل کر بھی دی تھی اور مسوری ارکانساس اور جنوب مغرب کے غلاموں کی انھوں نے الگ ریاستیں قائم کردی تھیں چونکہ یہ دستور کے عین مطابق تھا اس لئے کانگریس نے کینٹو، ٹینیسی، مسسپی اور لوسینیا کو تسلیم بھی کرلیا۔

ہوتے ہوتے شمال میں بھی غلامی کے خلاف جذبہ پیدا ہوا لیکن اس جذبے کی بنیاد اخلاقی جذبے پر نہیں تھی بلکہ اس میں سیاست کارفرما تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر جنوب کی بساتی ہوئی غلاموں کی ریاستیں آزاد ریاستوں سے بڑھ گئیں تو جنوب اپنے زراعتی مفادوں کے حصول میں کامیاب ہوجائے گا۔ اور شمال کے تجارتی مقاصد دب کر رہ جائیں گے۔

اس قسم کا پہلا بحران منرو کے زمانے میں آیا تھا اور اگرچہ وہ

خوش اسلوبی سے ختم ہوگیا تھا۔لیکن دونوں علاقوں (شمال اور جنوب) کو چوکنا کرگیا تھا۔ ۱۸۱۹ء میں جب کہ ملک میں گیارہ ریاستیں آزاد لوگوں کی تھیں اور گیارہ ہی غلاموں کی تو مسوری نے درخواست دی تھی کہ اسے بھی غلاموں کی ریاستوں میں گنا جائے۔ اس پر شمال کے نمائندے نے اعتراض کیا کہ اگر یہ درخواست منظور کرلی گئی تو ریاستوں کا توازن بگڑ جائے گا یعنی بارہ ریاستیں غلاموں کی ہو جائیں گی اور آزاد لوگوں کی صرف دس ہی رہ جائیں گی اور اس طرح غلامی دریائے مسس سپی کے مغرب تک پھیل جائے گی۔ لیکن جنوبی نمائندہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ مطالبہ دستور کے خلاف نہیں ہے۔آخر اس معاملے کا فیصلہ جنوبی ریاستوں کے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں ہنری کلے نے اس گتھی کا ایک اور حل پیش کیا۔ وہ یہ کہ مسوری کو غلاموں میں ملنے کی اجازت دے دی جائے اور میسیچوسٹس کے علاقے کا ایک حصہ جو مین کہلاتا تھا شروع ہی سے الگ تھلگ چلا آرہا تھا اس کو بطور ایک نئی ریاست کے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ شامل کرلیا جائے۔اس کے ساتھ ہی عرض بلد چھتیس اور تیس کے متوازی ایک خط مسوری کی جنوبی سرحد سے ملتا ہو کھینچ دیا جائے اور غلاموں کے لئے اس خط کا شمالی علاقہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔

جیکسن کے عہد میں بھی آزاد اور غلاموں کی ریاستوں میں توازن اسی طرح برقرار رہا کہ ایک ریاست نکل گئی تو دوسری آگئی۔ ۱۸۳۶ء

میں ارکانساس آزادوں سے نکل کر غلاموں میں چلی گئی تو اس کے بدلے میکیگن آگئی۔ ۱۸۴۵-۴۶ء میں آیوا گئی تو فلورڈا آگئی۔

غلامی کا مسئلہ جو جمہوریت کے شروع سالوں سے خاموش پڑا تھا اب ایک بحرانی کیفیت کی طرح اُبھر رہا تھا۔ شمال اور جنوب دونوں طرف کے لوگ چوپالوں اور پارکوں میں بیٹھ کر اسی مسئلے پر گفتگو کرتے تھے۔ پادری لوگ بھی اسی مسئلے کو اکثر چھیڑ دیتے تھے اور متعصب قسم کے مذہبی لوگ اس مسئلہ پر اونچ نیچ کی تفریق پھیلانے سے نہ چوکتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ مسئلہ ملک کے تمام سیاسی اور معاشی مسئلوں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آخرکار بڑے پیمانے پر ایک خانہ جنگی شروع ہوئی جس نے اس عقدہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔

چھٹا باب

ملک جو تقسیم ہو گیا

آج سے تقریباً سو برس پہلے جنگ کے دو نعرے لگے تھے جو آج تک ہر امریکی کے کانوں میں گونجتے ہیں۔

۱۔ "الامو کو یاد کرو"

۲۔ "چون چالیس یا جنگ"

پہلے ان دونوں نعروں کا پسِ منظر سمجھ لیجئے تاکہ آپ واقعات کے تسلسل کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ پہلے نعرے کا تعلق تو ٹکساس کے باشندوں کے اُس قتلِ عام سے ہے جو میکسیکو کی فوج کے ہاتھوں ۱۸۳۶ء میں ہوا تھا۔ ٹکساس امریکہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ میکسیکو کا ایک صوبہ تھا۔ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ ٹکساس کی آبادی جو زیادہ تر امریکی تھی میکسیکو کی حکومت کی اجازت سے وہاں آباد ہوئی تھی مگر جب میکسکو کی

حکومت نے دیکھا کہ آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان کا اقتدار اُٹھتا جا رہا ہے تو انھوں نے مزید لوگوں کو وہاں جاکر آباد ہونے سے روک دیا۔ یہ تھی اصل وجہ ٹکساس کے باشندوں کی ناراضی کی اور اسی پر جنگ چھڑی تھی۔ ابتداء اس طرح ہوئی کہ ٹکساس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس پر میکسیکو کا صدر حکومت سانتا آنا خود فوج لے کر ان "باغیوں" پر جا چڑھا۔ ایک عمارت تھی جس کا نام تھا الامو۔ یہ مشن کی عمارت تھی اور ایک دستہ اس کی حفاظت پر مامور تھا۔ میکسیکو کی فوج نے اس عمارت کو، اس کے محافظوں کو اور اس کے اندر رہنے والوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اس دردناک تباہی کا بدلہ ٹکساس والوں نے بہت جلدی لے لیا۔ اس نعرے کو استعمال کر کے جنرل ہاؤسٹن کی کمان میں ایک فوج نے میکسیکو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سانتا آنا کو گرفتار کر لیا۔ اب ٹکساس ایک آزاد جمہوریہ بن گیا اور جنرل ہاؤسٹن اس کا صدر۔ یہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ میکسیکو اسپین کا علاقہ تھا جو حال ہی میں آزاد ہوا تھا۔ ٹکساس کی آزاد حکومت کا چونکہ قدرتی طور پر امریکہ سے رشتہ تھا۔ لہٰذا ان کی یہ خواہش تھی کہ اپنی آزاد حکومت کو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ضم کر دیں لیکن چونکہ وہاں زرخرید غلاموں کا سسٹم جاری تھا اس لئے شمالی ریاستوں کے نمایندوں نے ٹکساس کی شمولیت پر اعتراض کر دیا۔ دوسرے میکسیکو کی حکومت نے اعلان کر دیا کہ اگر ٹکساس کو شمولیت کی اجازت نہ دی گئی تو اس کے معنے میکسیکو کے خلاف اعلان جنگ کے

ہوں گے۔ ملک میں یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ ۱۸۴۴ء کا الیکشن آگیا اور اسی نزاعی مسئلہ کو لے کر وہگ اور ڈیموکریٹک پارٹیوں نے الیکشن لڑا جس میں کہ پولک ڈیموکریٹک پارٹی کا امیدوار تھا۔ اور ہنری کلے وہگ پارٹی کا۔ پولک نے شمولیت کی زور شور سے موافقت کی لیکن کلے چونکہ صلح پسند طبیعت کا آدمی تھا اس لئے ذرا جھجک گیا۔ اس کا جھجکنا تھا کہ عوام نے پولک کو صدر منتخب کرلیا اور ٹکساس امریکہ میں شامل کرلیا گیا۔

دوسرا نعرہ اوریگن کے قضیے سے متعلق تھا۔ اوریگن بحرالکاہل کے شمال مغرب میں واقع تھا اور اس پر امریکہ اور انگلستان دونوں ہی اپنا اپنا حق جتاتے تھے۔ دونوں کا یہی دعویٰ تھا کہ اس سرزمین پر پہلی آبادی اسی کی ہے اور یہ کہ پہلے پہل اسی نے ہی اسے دریافت کیا تھا۔ امریکہ کہتا تھا کہ چوّن اور چالیس طول البلد اور عرض البلد کے ساتھ ساتھ کا سارا علاقہ اس کا ہے جس میں اوریگن بھی شامل ہے جس کی سرحد روسی الاسکا سے ملتی ہے۔ لیکن انگلستان اس چیز کو تسلیم نہ کرتا تھا چنانچہ یہ مطالبہ امریکہ کے عوام میں ایک نعرہ بن گیا۔ آخر صدر پولک نے معاملے کو نمٹانے کی غرض سے ۴۹ عرض البلد تک کے علاقے پر منظوری دے دی۔

اس کے فوراً بعد ہی ٹکساس کی جنوبی سرحد کا قضیہ کھڑا ہوگیا جو میکسیکو سے ملتی تھی۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی دیرینہ خواہش تھی کہ کمزور پڑوسی میکسیکو سے کسی بات پر جھگڑا کرکے اس پر قبضہ کرے لیکن اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ جھگڑے کی پہل خود میکسیکو کی طرف سے ہوئی۔ ایک تو یہ کہ

میکسیکو نے اس قضیے کے کسی بھی تصفیہ سے انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ دریائے ریو گرینڈ سے پیشقدمی کی اس پر امریکی فوجیں بڑھیں اور میکسیکو میں دور تک گھستی چلی گئیں۔ ادھر بحری فوج نے بحر الکاہل کے کنارے بسنے والے امریکیوں کی مدد سے دشمن کے ہاتھ سے کیلیفورنیا چھین لیا۔

۱۸۴۸ء میں میکسیکو کے دارالسلطنت پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اس کے باوجود بھی امریکہ نے صلح کی پیشکش کے بطور میکسیکو کی حکومت کیلیفورنیا اریزونا اور نیو میکسیکو کے علاقوں کے لئے ایک کروڑ پچاس لاکھ دینا کیا۔ اگرچہ بہت سے امریکیوں نے اس فیاضی کی مخالفت کی کہ جیتا ہوا علاقہ چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے اور پورے میکسیکو پر قبضہ کر کے امریکہ میں شامل کر لینا چاہئے۔ ان علاقوں کے امریکہ میں شامل ہو جانے کے بعد امریکہ کی حکومت اتنی وسیع ہو گئی جتنی آج کل ہے۔

۱۸۴۹ء میں کیلیفورنیا سے شور اُٹھا۔ "سونا۔ سونا" اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں یہ آواز پھیل گئی کہ کیلیفورنیا کی گھاٹیوں اور دریاؤں کی تہ میں کافی مقدار میں سونا موجود ہے۔ اس خبر سے نفع کے خواہاں ہزاروں امریکی بوسٹن اور نیویارک جیسے دور دراز علاقوں سے کیلیفورنیا کھنچے چلے آئے۔ سونے کی دریافت سے پہلے کیلیفورنیا کی آبادی گنجان نہ تھی۔ اس میں زیادہ تر ہسپانوی آباد تھے لیکن اکا دکا امریکی بھی اس کے ساحلوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں کیلیفورنیا کی کل آبادی چھ ہزار تھی۔ مگر سونے کی خبر اُڑنے سے سال کے آخر تک اُس کی آبادی

پچاس ہزار پہنچ گئی۔ ان آنے والوں میں زیادہ تر شمالی علاقوں کے لوگ تھے جنھوں نے آتے ہی کیلیفورنیا کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شامل کرنے کے لئے آواز اُٹھائی۔ یہ آواز ملک کے حق میں مفید ہی ثابت ہوئی کیونکہ کانگریس کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش تھا کہ میکسیکو سے لئے ہوئے علاقوں کی سرکاری حیثیت کیا ہو۔ اس پر ایک طبقہ اس خیال کا حامی تھا کہ ان علاقوں کے باشندے خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

ہنری کلے نے رائے دی کہ کیلیفورنیا کو بطور آزاد ریاست کے حکومت میں شامل کیا جائے (آزاد غلام ریاستوں کے متعلق آپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں) اور باقی علاقوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے اور ہر حصہ اپنی حیثیت مقرر کرے اور اس کے ساتھ ہی بھاگے ہوئے غلاموں کا ایکٹ پاس کرنے کے لئے ایک بل پیش کردیا کہ اگر کوئی غلام جنوبی علاقے سے شمالی علاقے میں چلا جائے تو اس کا فوراً پیچھا کیا جاسکتا ہے اور پکڑ کر اسے مالک کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں اس پر بڑی بحث ہوئی۔ جنوب کے نمائندے نے اعتراض کیا کہ یہ بل اس لئے ناقابلِ عمل ہے کہ اس میں غلامی کی غیر مشروط گارنٹی نہیں دی گئی ہے۔ اس نے کہا کہ غلام ذاتی جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کانگریس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ غلاموں کو ان علاقوں میں لے جانے سے روک دے لیکن ان تمام معترضین کو ملک کے اتحاد

اور سالمیت کے نام پر چپ ہونا پڑا اور آخرکار کانگریس نے تجویز منظور کردی۔ عوام یہ سمجھے کہ غلامی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہوگیا۔

زمانہ سازگار تھا۔ ہرطرف خوشحالی تھی۔ ملک بھر میں ریل کا جال بچھایا جارہا تھا۔ شمال مشرق میں بڑے بڑے کارخانے گونج رہے تھے۔ وسطِ مغرب سے غلّہ چلا آرہا تھا اور کیلیفورنیا سونا اُگلنے میں مصروف تھا۔ جنوب روئی کا زبردست خزانہ بن گیا تھا اور روئی کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۸۵۰ء میں جنوب کی کل آبادی تقریباً نوے لاکھ تھی جب کہ غلام مشکل سے تیس لاکھ ہوں گے۔ اگرچہ دستور میں ۱۸۰۸ء کے بعد مزید غلام امریکہ لانے کے لئے منع کردیا گیا تھا تاہم اب تک برابر آرہے تھے بلکہ لائے جارہے تھے۔ جنوبی حصّے میں صرف چند سفید فام لوگ تھے جن کے کھیتوں میں ہزاروں حبشی غلام کام کرتے تھے۔ یہاں غلامی کی شرائط بھی کچھ مختلف تھیں۔ ان سے سخت کام تو لیا جاسکتا تھا لیکن ان پر ظلم کوئی نہیں کرسکتا تھا بلکہ ذرا اور اونچے درجے کے کھیتوں پر کام کرنے والوں کو تھوڑی بہت تعلیم بھی دی جاتی تھی اور گرجا میں عبادت کا طریقہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد انھیں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے (اگرچہ وہ انگلیوں پر ہی گنے جاسکتے ہیں) جن کو اپنی خدمات کا تھوڑا بہت معاوضہ بھی ملتا تھا اور یہ اجازت تھی کہ وہ اس کو جمع کرکے اپنی آزادی اپنے مالکوں سے خرید سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہیں کہیں

غلاموں کی حالت بہت خراب تھی۔ حد سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ پٹتے تھے۔ ان سے بدسلوکی کی جاتی تھی اور نیلام کے ذریعہ ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ ان میں سے بہت سے اپنی بدنصیبی برداشت نہ کر سکتے اور موقع پاکر بھاگ جاتے کہ شاید کینیڈا یا امریکہ ہی کے شمالی علاقوں میں انھیں آزادی نصیب ہو اور شمالی لوگ اکثر انھیں پناہ دیتے تھے اور مطالبے پر واپس کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ بھاگے ہوئے غلاموں کا قانون جو کلے نے پاس کرنے کے لئے تجویز کیا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ ایسے غلاموں کو واپس کرنے سے انکار نہ کر سکیں۔ ان لوگوں کے انکار کرنے کی بھی در اصل ایک وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ شمال کے باشندے تو غلامی کا طریقۂ انقلاب امریکہ کے بعد ہی ختم کر چکے تھے۔ اس لئے غلاموں پر مظالم اور ان کے بھاگنے اور پکڑے جانے پر ان کا دل دُکھتا تھا اور اس طریقے کو وہ ختم کرانا چاہتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں بیچر سٹو نے ایک ناول "چچا ٹام کی کوٹھری" بھی لکھا تھا جس میں کھیتوں میں کام کرنے والے غریب غلاموں کی حالت کا نقشہ کھینچا تھا یہ ناول بڑا مقبول ہوا اور رائے عامہ اُبھارنے میں بہت مفید ثابت ہوا لیکن اس ناول سے زیادہ لوگ اس قانون سے بھڑکے جو ۱۸۵۴ء میں کنساس نبراسکا ایکٹ کے نام سے پاس ہوا۔ یہ ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے سینٹ کے ایک ممبر اسٹیفن ڈگلس نے پیش کیا تھا۔ اس قانون نے مسٹر کلے کے بھاگے ہوئے غلاموں کے قانون کو کالعدم کر دیا اس قانون سے

جنوب والوں کو ایک دفعہ پھر غلامی کو قائم رکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ ڈگلس کو کیا سوجھی تھی۔ خیال غالب یہ ہے کہ شاید صدارت کے لئے کھڑے ہونے کا خیال ہوگا اس لئے جنوب والوں کی ہمدردیاں اس طریقے سے حاصل کرنی چاہتا تھا۔ یا ہوسکتا ہے کہ اس کی بیوی نے اس پر زور دیا ہو کیونکہ وہ جنوبی علاقے کی رہنے والی تھی۔

بہرحال خرید کردہ علاقہ لوسینیا دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک کنساس اور دوسرا نبراسکا اور ان میں آبادی شروع ہوئی۔ شمال اور جنوب دونوں نے ان علاقوں میں اپنی بالادستی منوانی چاہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں دونوں طرف کے شورہ پشت اور متعصب قسم کے مذہبی لوگ شامل تھے۔ عوامی حکومت اس خانہ جنگی میں سخت ناکام ہوئی اور بڑی خونریزی ہوئی۔

تین سال بعد غلامی سسٹم کے ماننے والوں کو ایک اور فتح ہوئی۔ سکاٹ ایک غلام تھا اور ایک دفعہ آزاد علاقے میں رہ چکا تھا اس بنا پر اس نے سپریم کورٹ میں درخواست دیدی کہ اسے آزاد رہنے کا حق دیا جائے۔ چیف جسٹس نے فیصلے میں لکھا کہ غلام دستور کے مطابق جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں اور کانگریس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ان کو کسی علاقے میں جانے سے روکے۔ اس لئے غلامی کسی بھی نئی ریاست میں قائم کی جاسکتی ہے۔

اس مدت میں شمال میں ایک اور سیاسی پارٹی پیدا ہوئی۔
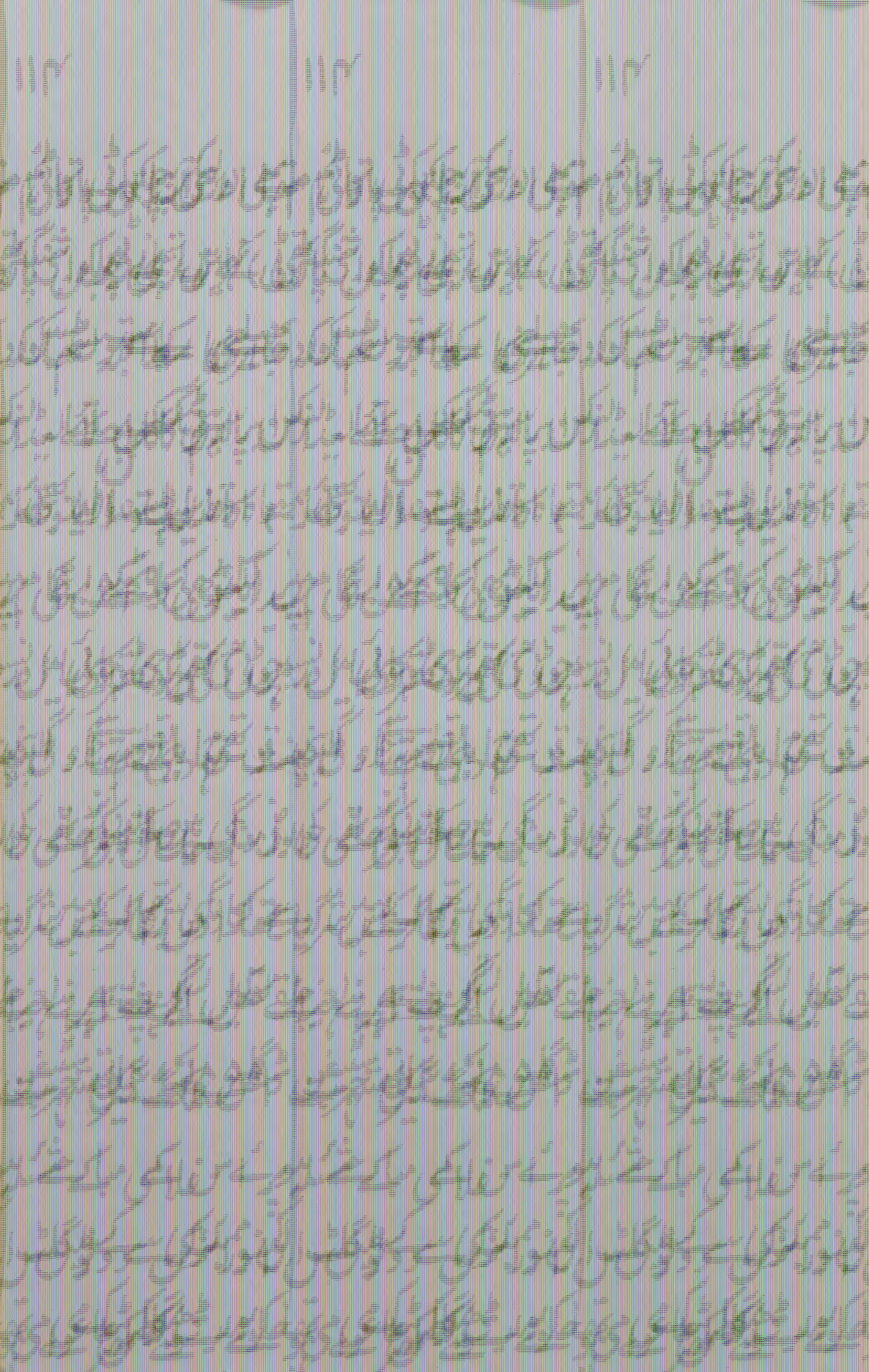
ڈگلس نے جواب دیا کہ ہاں یہ ہو سکتا ہے کیونکہ حکومت کسی پر غلامی ٹھونس نہیں سکتی چاہے وہ قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ اس جواب سے جنوب میں اس کی شہرت کے جو محل کھڑے ہوئے تھے ان کی بنیادیں ہل گئیں اور اگرچہ ڈگلس انتخاب چند ووٹوں سے جیت گیا لیکن ان میں ایک بڑے مقابلے کی بنا پڑ گئی اور لنکن کی یہ پیشگوئی ثابت ہو کر رہی کہ "یہ حکومت آدھی غلاموں کی اور آدھی آزادوں کی ہو کر نہیں رہ سکتی اسے یا تو بالکل غلاموں کے حق میں جانا پڑے گا یا بالکل آزادوں کے"۔ اس مباحثے سے اس کی شخصیت اور اس کی یہ پیشگوئی لوگوں کے دلوں میں برابر گھر کرتی چلی جا رہی تھی اور خاص طور پر شمال میں۔ لنکن ان خیالات کی بنا پر بہت مقبول ہو گیا تھا۔

قوم میں غلامی کے خلاف جذبہ بڑھتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ ۱۸۵۹ء میں تو غلامی کے ایک منچلے مخالف جان براؤن نے سرکاری اسلحہ خانہ پر حملہ بول دیا کہ اپنے انیس ساتھیوں کے لئے ہتھیار مہیا کر کے جنوب میں غلامی کو ختم ہی کر ڈالے اگرچہ براؤن گرفتار ہو کر تختہ دار پر بھی لٹک گیا مگر جو حرکت وہ کر گیا اس سے اس کھچاؤ اور تناؤ کا بڑی آسانی سے اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت ملک میں غلامی کے مسئلے پر شمال اور جنوب میں پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس کی یہ حرکت قانون کے خلاف تھی مگر سارے ملک نے اس کی تعریف کی بلکہ مشہور فلاسفر اور شاعر ایمرسن نے تو اس کو شہید کہہ دیا اور حضرت عیسیٰ سے جا ملایا۔

جذبات کا یہ لاوا پوری شدت سے پک رہا تھا اور آخر ۱۸۶۰ء کے انتخابات میں پھوٹ ہی پڑا۔ ری پبلکن پارٹی نے لنکن کو صدارت کے لئے کھڑا کردیا اور لنکن اپنے تمام حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر انتخاب جیت گیا۔ اگرچہ جنوب نے اسے ایک ووٹ بھی نہیں دیا تاہم باقی ملک سے وہ چالیس فی صدی ووٹ لے گیا۔ ڈگلس دویم رہا کیونکہ جنوب نے اس کی زبردست حمایت کی۔

لنکن کی فتح سے جنوب میں اس کے خلاف جذبات نے ایک نئی کروٹ لی۔ جنوبی کیرولینا ریاستہائے متحدہ سے الگ ہوگیا اور اپنے ساتھ اس نے کئی اور ریاستوں کو بھی توڑ لیا۔ ان سب نے مل کر ایک نئی حکومت بنا ڈالی اور اپنا صدر جیفرسن ڈیوس کو بنا لیا۔ ڈیوس کانگریس کا ممبر رہ چکا تھا۔ حکومت میں محکمہ امور جنگ کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے چکا تھا۔

ان ریاستوں کے مرکز سے ٹوٹنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ لنکن کے صدر ہونے کے بعد انھیں یقین ہوگیا کہ غلامی سسٹم ختم کردیا جائے گا اور ان کی آسانیاں اور نفع اندوزیاں اور ظالمانہ کارروائیاں لنکن کے ہاتھوں ہمیشہ کی نیند سو جائیں گی کیونکہ لنکن کے خیالات کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی بلکہ سارا ملک جانتا تھا کہ وہ غلامی کا کس قدر سخت مخالف ہے۔ خیر تو جب کانگریس نے دیکھا کہ ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے تو کئی طریقوں سے جنوب کو راہ راست

پرلانے کی کوشش کی۔ پھسلایا بھی دھمکایا بھی مگر نتیجہ صفر سے آگے نہ بڑھ سکا انھیں یقین تھا کہ اگر غلامی کو پھیلنے کا موقع نہ مل سکا تو شمال سے لوگ نہ صرف جنوب کی سیاسیات اور اقتصادیات پر چھا جائیں گے بلکہ پورے ملک پر پنجے گاڑ دیں گے۔ لیکن صدر لنکن پر ان باتوں کا ذرہ برابر اثر نہیں تھا وہ اپنی جگہ پہلے کی طرح اٹل تھا البتہ ۱۸۶۱ء کی صدارتی تقریر میں اس نے بہت ہی مصالحانہ الفاظ استعمال کئے بلکہ ایک حد تک جنوب کے خیالات کی تائید بھی کی۔ اس نے کہا کہ میں غلامی کو پھیلانے کا مخالف ہوں لیکن جہاں یہ پہلے سے موجود ہے مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں۔ لنکن نے جنوب کے لوگوں کو یاد دلایا کہ یہ ملک دو قوم کا مشترک سرمایہ ہے اور روحانی جسمانی، سیاسی غرض کسی طرح اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ جنوبی من مانی کارروائی کریں اور علیحدگی اختیار کر لیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین دلا دیا کہ اس سلسلہ میں کوئی طاقت دبانے اور کچلنے کے لئے استعمال نہیں کروں گا تاوقتیکہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت کے خلاف طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔

جنوب نے اس تقریر کا ایک مہینے بعد چارلسٹن بندرگاہ میں جواب دیا جہاں ریاستہائے متحدہ کا ایک قلعہ تھا جس میں فوجی چھاؤنی پڑی ہوئی تھی۔ اس قلعہ میں رسد کم پڑ گئی۔ اب یا تو لنکن سمندر کے راستے رسد بھیجتا یا پھر قلعہ جنوب کی نوزائیدہ حکومت کے حوالے کر دیتا۔ لیکن لنکن نے رسد بھیجنا ہی مناسب سمجھا اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ اس

میں کوئی فوجی سامان نہیں ہے۔ لیکن جنوب کی حکومت کو یقین نہ آیا اور وہ یہی سمجھے کہ ہماری تباہی کے لئے سامان بھیجا جا رہا ہے چنانچہ اس قلعہ پر اپریل ۱۸۶۱ء میں توپوں کے منہ کھول دیئے۔ مٹھی بھر فوج کہاں تک مقابلہ کرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور قلعے پر بجائے ریاستہائے متحدہ کے جھنڈے کے نئی جنوبی حکومت کا جھنڈا چڑھا دیا گیا۔

اس خبر سے ملک میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ صدر لنکن نے قومی اتحاد کو پورے ملک میں بحال کرنے کے لئے پچھتر ہزار والنٹیر طلب کرلئے اسی اثناء میں چار ریاستیں (ورجینیا، شمالی کرولینا، ارکانساس اور ٹینیسی) اور مرکزی حکومت سے ٹوٹ گئیں۔ ورجینیا کا تھوڑا سا حصہ البتہ وفادار رہا جس کو بعد میں ایک علیحدہ ریاست مغربی ورجینیا بنا کر مرکز کے ساتھ ملالیا گیا تھا۔ اس طرح کل ملا کر گیارہ ریاستیں الگ ہوگئیں اور تیئیس (۲۳) مرکز کے ساتھ رہیں۔

اس اتنے بڑے چھوٹ چھٹاؤ کے بعد بھی آبادی اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے شمال جنوب پر فوقیت رکھتا تھا۔ شمال کی آبادی تقریباً دو کروڑ تھی اور کل تیئیس ریاستیں تھیں جب کہ الگ ہونے والوں کی آبادی کسی طرح ایک کروڑ سے زائد نہ تھی۔ صنعتی اعتبار سے بھی شمالی علاقے میں بمعہ وسطی مغربی حصے کے اعلیٰ پیمانے کے کارخانے تھے جو جنگی سامان اور ریلیں تیار کرتے تھے جبکہ جنوب کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے وہ اپنی جنگی ضرورتوں کے لئے یورپ کے

محتاج تھے لیکن چند باتیں ایسی بھی تھیں جن میں جنوب شمال پر سبقت لئے ہوئے تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر جنگ ہوتی تو اس کی پوزیشن اپنا بچاؤ کرنے والے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ آور کو طاقت بھی زیادہ لگانی پڑتی ہے۔ روپیہ بھی اور سامان بھی زیادہ خرچ کرنا پڑتا حالانکہ بچاؤ کرنے والا صرف اپنا بچاؤ کرتا ہے اس لئے نسبتاً فائدے میں رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ محاذ جنگ ان کے لئے بہت مختصر تھا اور مرکز کے لئے طویل۔ ان کی آبادی میں شکاری اور خانہ بدوش زندگی کے عادی زیادہ تھے اس وجہ سے انھیں سپاہی آسانی سے مل سکتے تھے اور شمال کے علاقے کے لوگ چونکہ زیادہ تر آرام پسند تاجر اور کارخانوں کے کام کرنے والے تھے اس لئے سپاہی آسانی سے نہیں مل سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی مدد کے لئے ان کے غلام بھی تھے جو ان کا کام سنبھال کر انھیں آسانی سے جنگی مصروفیات کے لئے فارغ کر سکتے تھے۔

وہ خانہ جنگی جو چارلسٹن کے قلعہ پر قبضہ کرنے سے شروع ہوئی تھی جب آگے بڑھی تو مشرق میں ورجینیا پر اور مغرب میں دریائے مسسپی پر اچھی طرح دو دو ہاتھ ہوئے۔ اور جب ورجینیا مرکز سے علیحدہ ہوگیا تو شہر واشنگٹن سے تقریباً سو میل ہٹ کر نئی دارالحکومت کا دارالسلطنت رچمنڈ میں قائم کیا گیا چنانچہ رچمنڈ چلو کا نعرہ لگا کر شمالی نے تقریباً تیس ہزار جوان ورجینیا پر لاکر ڈال دیئے کہ مینہ باغیوں کے ذرا کس بل دیکھیں۔ لہٰذا ۲۰ رجولائی ۱۸۶۱ء کو پہلا رن پڑا۔ لیکن

شمالی لوگ اس جنگ کو ایک کھیل سمجھ کر گئے تھے۔ بیویاں بھی ساتھ تھیں اور کھانے پکانے کا سامان اس طرح لے کر گئے تھے جیسے کہیں تفریح کرنے جا رہے ہیں۔ جب جنوبی باشندوں نے ان کا چھپ چھپ کر سخت مقابلہ کیا تو ان کے پیر اُکھڑ گئے اور زبردست نقصان اُٹھا کر اپنے مستقر واشنگٹن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور پھر ایک نیا عزم لے کر فوج کی تعداد بڑھائی۔ صدر لنکن نے جارج میک کلان کو کمان سونپی کیونکہ وہ بڑا اچھا فوجی اور منتظم مانا جاتا تھا اور سپاہی بھی اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میک کلان نے ۱۸۶۲ء میں سمندر کے راستے ایک لاکھ کی بھاری جمعیت رچمنڈ کے جنوب مشرق میں لا کر ڈال دی اور اس کی سرحدوں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جنوبیوں کی فوج ان سے تقریباً آدھی تھی۔ میک کلان کو نہایت اچھی کامیابی ہو رہی تھی اور فتح قریب ہی تھی کہ اسے خیال گزرا کہ دشمن کی فوج کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس خیال سے اس کا دل چھوٹ گیا اور آخر پیچھے ہٹتے ہٹتے واشنگٹن جا کر رکا۔ اس ہزیمت سے صدر لنکن پر بھی مایوسی چھا گئی۔

ادھر دوسری ملکی اُلجھنوں نے بھی اسے گھیر لیا۔ چونکہ جنوب سے انگریزوں کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات ہمیشہ سے رہے تھے اس لئے ان کی ہمدردیاں جنوب ہی کے ساتھ تھیں اور مرکز کے رہے سہے تعلقات انگریزوں سے اس لئے ختم ہو گئے کہ بندرگاہوں کی مکمل ناکہ بندی کی وجہ سے انگلستان کو روئی کی سپلائی بند ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ مرکز

کے ایک جنگی جہاز نے برطانیہ کے ایک جہاز کو روک لیا تھا جس
میں جنوبی حکومت کے دو سفیر تھے اور بوسٹن میں قید کر دیا تھا۔ اس پر
انگلستان نے احتجاج کیا اور جنگ کی دھمکی دیدی تھی۔ اس صورت
حال میں مرکز کو تباہی سامنے کھڑی نظر آرہی تھی۔ لہذا لنکن نے دونوں
سفیروں کو رہا کر دیا اور برطانیہ سے معذرت کی۔ قسمت کی بات انگریزوں
نے شمالی لوگوں کے ساتھ غلامی کو مٹانے کی جدوجہد میں ہمدردی کا
اظہار کر دیا ورنہ شاید یہ معذرت وغیرہ بھی بے کار ہی جاتی۔

درایں اثنا جنرل یولیسس گرانٹ مرکز کی توپ بردار کشتیاں لئے
دریائے مسسیپی میں بڑھتا چلا جا رہا تھا کیونکہ دریا پر اب تک مرکز کا
قبضہ تھا۔ وہ جنوبی حکومت کے علاقے میں دور تک گھس گیا اور شیلوہ
فتح کر لیا۔ اگرچہ یہ فتح اُسے بہت مہنگی پڑی مگر وہ بڑھتا ہی رہا اور
آگے جا کر وکسبرگ کا محاصرہ کر لیا۔ ان کارناموں نے گرانٹ جیسے
مدہوش شرابی کو جس نے بے انتہا شراب پی کر اپنی فوجی زندگی تباہ
کر لی تھی قومی ہیرو بنا دیا۔ لیکن مغرب میں گرانٹ کی فتوحات کے
مقابلے پر مشرق میں مرکز کی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں
اور پریشان لنکن منتظر تھا کہ کسی بڑی کامیابی کی خبر آئے، تو وہ قوم کی
ڈھارس بندھائے اور آخر وہ لمحہ آ ہی گیا کہ یہ خانہ جنگی نہ صرف مرکز
کی بقا کا باعث ہوئی بلکہ جنوب میں غلاموں کو آزاد کرانے میں بھی
مددگار بنی۔ دراصل مرکز کو بچالے جانا ہی لنکن کا مقصد تھا۔ وہ اپنی تقریر

میں کہہ چکا تھا کہ اگر مرکز غلاموں کو بغیر آزاد کرائے ہی باقی رہ سکتا ہے تو میں مرکز کو باقی رکھوں گا اور اگر مرکز کی بقاء ان کے آزاد کرانے ہی میں ہے تو میں انھیں آزاد کرا کر ہی دم لوں گا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ طے کر دیا گیا کہ غلاموں کو آزاد کرانا ہی ہے کیونکہ اس پالیسی سے ایک طرف تو شمال کے لوگ متحد رہیں گے اور دوسری طرف دنیا کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو جائیں گی اور اس طرح جنوب کی بیرونی دُنیا سے معاونت کی اُمید ختم ہو جائے گی۔

یکم جنوری ۱۸۶۳ء کو جب جنرل میک کلان نے ایک حملے کا اعلان کیا تو صدر لنکن نے اعلان کر دیا کہ جو اس وقت جنوب میں غلام ہیں ہم انھیں غلام نہیں رکھیں گے۔ اس اعلان کا مقصد یہ تھا کہ جنوب کے غلاموں اور مالکوں میں تفرقہ پیدا ہو جائے۔ اگرچہ یہ صرف ایک وعدہ تھا لیکن لنکن کا خیال یہ تھا کہ جنوب کو فتح کرنے کے بعد دستور میں غلاموں کی آزادی کے متعلق ترمیم لانے میں یہ وعدہ مددگار ثابت ہوگا اور کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکے گا۔ اس اعلان سے قوم میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا لیکن جنرل میک کلان وقت پر نہ صرف آگے نہیں بڑھ سکا بلکہ اسے سخت جانی نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا اور جنوب کا جنرل لی تعاقب کرتا ہوا گیٹس برگ (پنسلونیا) تک چڑھ آیا۔ شمال کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور قریب تھا کہ ایک ہی ہلّے میں دشمن کا ہمیشہ کے لئے قصّہ ہی ختم کر دیتا۔ گیٹس برگ

میں دشمن نے پچھتر ہزار کی جمعیت کے ساتھ مورچے بنا لیے۔ اس ہزیمت کا صدر لنکن پر بہت گہرا اثر ہوا اور آخر اُس نے میک کلان کی جگہ جنرل جارج میڈلے کو مقرر کر دیا اور نوے ہزار فوج اس کی سرکردگی میں دیدی لیکن یکم اور ۲ جولائی ۱۸۶۳ء کو میڈلے نے بھی ایک زبردست شکست کھائی۔ اس شکست نے جنوبیوں کے حوصلے بہت بلند کر دیئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ جولائی کو جنرل لی نے آگے بڑھ کر مرکز کے مستقر پر حملہ کر دیا جو ایک پہاڑی پر واقع تھا۔

جنرل پکٹ جنوبی افواج کے بہترین پندرہ ہزار جوان لے کر بڑھا اور "فتح یا موت" کے عزم کے ساتھ گھستا چلا گیا۔ جنوبیوں نے پوری پہاڑی کو گھیر لیا اور بڑھتے بڑھتے وہ اتنے نزدیک آگئے کہ مستقر کا جھنڈا اُنھیں صاف نظر آنے لگا جس پر انھوں نے خوب جی کھول کر گولیاں برسائیں۔ جنگ اپنے شباب پر پہنچ گئی اور نیلی اور خاکی فوجوں میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی (جنوبی افواج کی وردی کا رنگ خاکی تھا اور شمالی کا نیلا) بجائے گولیوں کے بندوقوں کے کندے اور برچھیاں بھالے زندگیوں کا فیصلہ کرنے لگے۔ چونکہ جنگ کے شعلے ان کے گھر کو پھونکے ڈال رہے تھے اس لئے شمالی ایسے جان توڑ کر لڑے کہ جنوبیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اور آخر زبردست جانی نقصان اُٹھا کر اُنھیں پیچھے ہٹنا پڑا اور شمالیوں نے گیٹس برگ کو آزاد کرا لیا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل گرانٹ کو مغربی محاذ پر فتح نصیب ہوئی۔

اور وکسبرگ نے بھوک سے تنگ آکر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتح سے دریائے مسسپی کے مغرب میں جنوبی ریاستیں اپنی نئی حکومت کے مرکز سے کٹ گئیں۔ اور اب گرانٹ کے لئے ان کو زیر کرنا بہت آسان ہوگیا۔ ان کامیابیوں پر ۴؍جولائی ۱۸۶۳ء کو شمالیوں نے بڑی شان سے یوم آزادی منایا۔

گیٹس برگ سے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا تھا۔ اور یہ خانہ جنگی اگرچہ دو سال مزید جاری رہی لیکن جنوب کے اُکھڑے ہوئے قدم جم نہ سکے ۱۸۶۳ء کے موسم خزاں میں صدر لنکن نے جنگ آزادی کے شہیدوں پر جو تقریر کی وہ ایک یادگار اور لاثانی تقریر ہے۔ اس نے کہا "ہم قسم کھاتے ہیں کہ ان شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہ قوم خدا کے فضل سے اپنی آزادی کو ایک نیا جنم دے گی اور عوام کے لئے عوام کی بنائی ہوئی عوامی حکومت صفحۂ ہستی سے نابود نہیں ہوسکتی"۔

خانہ جنگی کا آخری نصف حصہ شمال کے ان اقدامات کی ایک کہانی ہے جو انھوں نے اپنے دشمن کی زندگی کا ایک ایک سانس ختم کرنے کے لئے کئے۔ ان کی جنگی اسکیم سیدھے سادھے الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ پٹومک کی افواج ورجینیا سے گزر کر رچمنڈ کی طرف بڑھتی رہیں اور گرانٹ کی فوجیں ٹینس سی اور جارجیا میں جا گھسیں۔

اس خانہ جنگی میں گرانٹ نے اپنی فوجی قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ شمال کی گرتی ہوئی دیوار کو اس طرح سنبھالا کہ حق ادا کردیا۔

لنکن نے اس کی بہادری کی داد دیتے ہوئے اسے شمالی افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا اور اسے جنرل لی کے مقابلے پر بھیجدیا جو ورجینیا کے نواح میں مورچے سنبھالے پڑا تھا۔

۱۸۶۴ء میں گرانٹ نے رچمنڈ کی طرف بڑھنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن جنرل لی نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور حیران کُن نقصان پہنچایا لیکن گرانٹ نقصان پر نقصان اُٹھانے کے باوجود اڑا رہا اور ایک قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ آخر لی کی افواج رسد کی کمی اور گرانٹ کے سخت حملوں کے باعث کمزور پڑتی چلی گئیں۔

اسی اثناء میں ۱۸۶۴ء کا صدارتی انتخاب آپہنچا۔ ری پبلکن پارٹی نے لنکن کو کھڑا کیا اور ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے لنکن کا پُرانا ساتھی جنرل میک کلان مقابلہ پر آیا۔ ری پبلک پارٹی جنگ ہر قیمت پر جاری رکھنے کے حق میں تھی لیکن ڈیموکریٹک پارٹی چاہتی تھی کہ صلح و آشتی کا کوئی راستہ نکال کر جنگ ختم کر دی جائے چنانچہ انہی مسئلے کو سامنے رکھ کر الیکشن لڑا گیا۔ لنکن کی توجہ اگرچہ گرانٹ اور لی کی ٹکر پر لگی ہوئی تھی لیکن انتخابی میدان اسی کے ہاتھ رہا۔

جنگ کا اختتام قریب آرہا تھا۔ جنرل شیرمین کا قول تھا کہ جنگ ایک مصیبت ہے اور اُس نے اس مصیبت کو جلد سے جلد ختم کر دینے کی ٹھان لی تھی۔ شیرمین جارجیا میں آگ لگاتا ہوا اٹلانٹا کو ہو لیا اور تین سو میل تک بلا کسی مقابلے کے بڑھتا چلا گیا۔ جو کچھ اس کے راستے

میں پڑا اس نے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اور آخر کار کرولینا میں تباہی مچاتا ہوا ورجینیا میں جنرل گرانٹ سے جا ملا۔ جب رچمنڈ بھی مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور جنرل لی کی ساری اُمیدیں اور سہارے ٹوٹ گئے تو آخر مجبور ہو کر اس نے ۹ اپریل ۱۸۶۵ء کو ہتھیار ڈال دیئے اور بقول شیرمین یہ مصیبت ختم ہو گئی۔

چار سال کی اس ہولناکی میں امریکی قوم کو زبردست جانی اور مالی قربانیاں دینی پڑیں اور مرکز کے کل شہیدوں کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی (دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹-۴۵ء میں بھی تقریباً اتنے ہی امریکی کام آئے تھے) یہ نقصان یک طرفہ نہیں تھا بلکہ جنوب کو بھی کچھ کم آفت نہیں جھیلنی پڑی۔ ان کے گھر برباد ہو گئے۔ آدمی مارے گئے۔ سامان زندگی تباہ ہو گیا اور ذرائع آمد و رفت ختم ہو گئے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے زرخرید غلام جن کی مجموعی قیمت تقریباً بیس لاکھ ڈالر ہوتی ہے بلا کسی معاوضے کے چھن گئے یعنی آزاد ہو گئے۔

جنگ تو ختم ہو گئی مگر صدر لنکن کو جنگ کے بعد آنے والی مشکلات کا پوری طرح احساس تھا جس کا اظہار اس نے اپنی دوسری صدارت کی افتتاحی تقریر میں بھی کیا۔ ”ہمارے دل میں کسی کی طرف سے کوئی میل نہیں ہے، اور ہم سب کی بھلائی کے خواہاں ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر قوم کے زخموں پر مرہم رکھیں اور تعمیری کام میں لگ جائیں۔“ اور لنکن نے اس قوم کو ازسرِنو تعمیر کا آسان ترین راستہ بھی دکھایا۔ بہت سے ری پبلکنوں کا

خیال تھا کہ جنوب کو اب اپنے کئے کی سزا ملنی چاہئے اور ان کو ان تمام حقوق سے محروم کر دینا چاہئے جو انھیں الگ ہونے سے پہلے حاصل تھے لیکن لنکن بہت فراخ دل تھا اس نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اپنے مذکورہ الفاظ پر جما رہا اور نہ صرف ان کے حقوق بحال کر دیئے بلکہ ان کو عوامی حکومت میں بھی حصہ دیا اور خوش آمدید کہا۔

لنکن نے جنگ کے دوران میں ایک منصوبہ بنایا تھا کہ اگر جنوبی ریاستوں کے دس فیصدی لوگ بھی مرکز کی وفاداری کا عہد کرلیں تو ان کو دوبارہ ریاستیں قائم کرنے اور کانگریس میں شرکت کرنے کی اجازت دیدی جائے گی۔ اور یہ منصوبہ اس نے اب پورا کیا اور ٹینس سی، ارکانساس لوسینیا کو مرکز میں پھر بطور ریاستوں کے نمایندگی دیدی۔ ری پبلکن کانگریس (پارلیمنٹ) نے یہ بالکل نہ سوچا کہ اگر ریاستیں دوبارہ بنادی گئیں تو ان ریاستوں کے بسنے والے ڈیموکریٹک خیالات کے لوگ شمالی ڈیموکریٹوں سے مل کر ری پبلکن اقتدار کو ختم کر دیں گے اور یہ کہ جنوب کو اب دبا کر رکھنا ہی زیادہ موزوں ہے۔ اسی طرح تعمیر نو کے لئے ہدایات کانگریس کی طرف سے جاری ہونی چاہئیں نہ کہ صدر کی طرف سے جس کے خیالات میں حد سے زیادہ خیرسگالی کے جذبات موجود ہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوا لیکن کیا لنکن اس سلسلے میں اپنے قانونی اور انتظامی معاملات میں اپنی چلا سکتا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ جنگ ختم ہونے کے صرف پانچ روز بعد ہی لنکن اور اس کی بیوی

ایک تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک ایکٹر جس کا نام جان ولکس بوتھ تھا ان کے بوکس پر پہنچگیا اور لنکن کے سر میں گولی داغ دی ۔ وہ وہاں سے فرار ہونے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن ایک کھیت میں گھر گیا اور چونکہ اس نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کیا لہٰذا اسے وہیں گولی ماردی گئی ۔ صدر لنکن گولی کے زخم کی تاب نہ لاسکا اور صبح تک اس دنیا سے چل بسا ۔ شمالیوں کا دانشمند عظیم اور نیک لیڈر ان سے چھن گیا ۔ ان پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ۔ اس کی موت پر جنوب کے باشندوں کو بھی رنج ہوا کیونکہ اگر وہ زندہ رہتا تو ان کی اس مصیبت زدہ حالت میں ضرور مدد کرتا ۔

قائم مقام صدر اینڈریو جانسن کے زمانے میں یہ لٹی پٹی امریکی قوم اگرچہ منہ کے بل آرہی مگر اتنا ضرور ہوا کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوگئی جس کی بالادستی تمام ریاستوں پر مسلم تھی ۔

حصّہ دوم

تمہید

خانہ جنگی کے اختتام کے ساتھ امریکہ کی تاریخ کا پہلا نصف حصہ بھی ختم ہو جاتا ہے اس زمانے میں قومیت کی بنیاد رکھی گئی اور انفرادی جمہوریت کا عام کردار قائم ہوا۔ امریکہ کی اقتصادیات قطعی طور پر زراعت پر مبنی تھیں۔ اگرچہ انیسویں صدی کے وسط تک شمالی حصہ صنعت میں کافی ترقی کر چکا تھا۔ تجارت بھی اس عرصے میں زیادہ تر مقامی ہی رہی۔ ہندوستانی جو مغربی میدانوں میں بستے تھے قدم قدم پر مشعلِ راہ کا کام دیتے تھے۔

سنہ ۱۸۶۵ء میں حالات بدلے اور دوسرے ملکوں کے لوگ امریکہ میں آباد ہونے کے لئے اُمنڈ پڑے۔ بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے۔ صنعت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ نئی نئی ایجادیں ہوئیں۔ کانوں میں سے کوئلہ اور لوہا برآمد کیا گیا تاکہ بڑھتی ہوئی صنعتی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ زمین کھود کر لاکھوں کنستر

تیل نکالا گیا۔ سارے ملک میں مکڑی کے جالے کی طرح ریلوے لائن بچھائی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بجلی پیدا کی گئی جس سے روشنی ملی اور ذرائع رسل و رسائل کو ترقی ہوئی۔

جب امریکہ کے وسیع ذرائع کام میں لائے گئے تو دولت کا انبار لگ گیا اور سمجھدار بیوپاریوں کی تو تجوریاں بھر گئیں۔ دولت کی اس افراط نے سرمایہ دار اور مزدور دونوں کو اپنی اپنی جگہ منظم کر دیا۔ مزدور نے سرمایہ دار کی دولت میں سے اپنا حصہ اس طرح بٹایا کہ مزدوری کی شرح میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ امریکہ کی آبادی سنہ ۱۹۰۰ء میں سات کروڑ ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی اور بحر الکاہل کے ساحل سے بحر اوقیانوس کے ساحل تک امریکہ میں آبادی ہی آبادی نظر آنے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ براعظم بھی چھوٹا پڑ جائے گا۔ لہذا امریکیوں میں کبھی کبھی یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح وہ بھی اپنے علاقے سے باہر نکل کر دوسرے علاقوں کی زمین فتح کریں۔

خانہ جنگی نے اگرچہ خون بھی کافی بہایا اور ملک کو بدحال بھی کر دیا لیکن تباہ نہیں کیا برخلاف اس کے باشندوں کو بیدار کر دیا۔ انھیں اپنی عظمت کا احساس کرا دیا اور انھیں بہتر وسائل اور بہتر ذرائع پیدا کرنے پر اُکسایا اور یہیں سے زمانۂ حال کی ابتدا ہوتی ہے۔

ساتواں باب

تعمیرِ نو

۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۷ء کا زمانہ امریکہ میں سرگرم تعمیرِ نو کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں مادہ پرستی، بلند عزمی اور شریر النفسی کا ایک سحر انگیز امتزاج تھا۔

انڈریو جانسن کی غیر متوقع صدارت کچھ پائدار ثابت نہ ہوئی۔ مشکل یہ تھی کہ اس غریب سے نہ شمال کے لوگ خوش تھے نہ جنوب کے حالانکہ وہ خود جنوبی تھا اور اس کے علاوہ وہ مخلص بھی تھا لیکن اس میں وہ صفات موجود نہ تھیں جو ایک لیڈر میں ہونی چاہئیں۔ اس کے زمانے میں دو واقعات ایسے ہوئے کہ انھوں نے اس کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پہلا تو یہ تھا کہ اس کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے زار روس سے ستر لاکھ ڈالر میں الاسکا کا علاقہ خرید لیا اور دوسرے یہ کہ حکومت نے منرو کے اصول پر عمل کرتے ہوئے فرانسیسیوں کو حکم دے دیا کہ میکسیکو خالی

کردیں کیونکہ وہ وہاں اپنی سلطنت جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب جانسن نے تعمیر نو کے لئے لنکن والے منصوبے پر عمل کرنا چاہا تو کانگریس نے اس سے اختلاف کیا۔ ہوا یہ کہ جنوب کی نئی قائم شدہ ریاستوں نے اپنے نمایندے جب کانگریس کے لئے واشنگٹن بھیجے تو انھیں کانگریس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی کہ جنوب کی آزاد حکومت میں کچھ نمایندے عہدہ دار رہ چکے ہیں اور اس لحاظ سے وہ غدار ہیں باغی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی حکومتوں نے کچھ ایسے قانون پاس کئے تھے جن سے حبشی غلاموں کو پوری آزادی نہ ملتی تھی۔ اور شاگردی کا سسٹم جو انھوں نے جاری کیا تھا دوبارہ غلامی کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جانسن کی مرضی کے خلاف کانگریس نے پندرہ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ وہ جنوب کی فضا اور حالات کا مطالعہ کر کے رپورٹ کرے کہ ان ریاستوں کے ساتھ کیا برتاو رکھا جائے جو مرکز سے ٹوٹ گئی تھیں۔

دسمبر ۱۸۶۵ء میں دستور میں تیرھویں ترمیم بابت تنسیخ غلامی داخل کی گئی اور اس کی رو سے تمام ریاستہائے متحدہ میں غلامی کو ختم کر دیا گیا اور جنوب کی کچھ ریاستوں کے علاوہ باقی سب نے اس کی تائید و تصدیق کر دی۔ حبشی اب آزاد تو ہو گئے مگر ابھی ان کو حقوق شہریت اور حقوق رائے دہندگی دینا باقی تھے۔ چنانچہ ان حقوق سے متعلق چودھویں اور پندرھویں ترمیمات داخل ہوئیں جن کی رو سے جنوب کی بغاوت کے لیڈروں سے ووٹ کا حق چھین لیا گیا اور سابقہ غلاموں کو عطا کر دیا گیا۔ جب چودھویں ترمیم جنوبی

ریاستوں کو تصدیق کے لئے بھیجی گئی تو علاوہ ٹینس سی کے باقی تمام ریاستوں نے اسے نامنظور کر دیا۔ مرکز کے قانون کی یہ توہین دیکھ کر کانگریس کو تعمیرِ نو کا قانون (ری کنسٹرکشن ایکٹ) ۱۸۶۷ء میں پاس کرنا پڑا تاکہ انھیں اطاعت پر مجبور کیا جا سکے۔ اگرچہ یہ قانون ہی بہت کافی سخت تھا لیکن بغاوت کے جراثیم کو بالکل ختم کرنے کے لئے جنوب کی کل ریاستوں (علاوہ ٹینس سی کے)، پانچ فوجی علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر علاقہ ایک میجر جنرل کی ماتحتی میں دے دیا گیا اور کافی تعداد میں فوج متعین کر دی کہ نظم سختی کے ساتھ قائم رہے۔ حبشیوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ سفید فام لوگوں کے ساتھ مل کر ہر ریاست میں حکومت بنائیں اور چودھویں ترمیم کی اپنی حکومت سے تصدیق کرائیں۔ اس کے بعد ان کی ریاست کو متحدہ ریاستوں میں شامل ہونے کی اجازت ہوگی۔

جو حکومتیں اس طرح بنیں وہ سابقہ حکومتوں سے بالکل مختلف تھیں ان میں نہ بڑے بڑے تاجر تھے اور نہ دوسرے اونچے پیشوں کے لوگ بلکہ صرف غریب حبشی تھے جن میں سے کچھ تو صرف لکھنا اور پڑھنا ہی جانتے تھے اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ ان میں پسماندہ کسان بھی تھے جو انہیں کی طرح اَن پڑھ تھے۔ ان بیچاروں کو معلوم ہی نہ تھا کہ روپیہ کا صحیح مصرف کیا ہے اور اخراجات کو کس طرح پورا کرنا چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے دل کھول کر پبلک اصلاحات پر، تنخواہوں پر اور ذاتی عیش و آرام پر خرچ کیا۔ روپے کے اس بیجا مصرف پر سارے ملک کے سیاستداں ادھر ڈھل

گئے کیونکہ ان گنوار قانون سازوں کی مدد کرنے کے بہانے اس لوٹ میں حصہ بٹانے کا ان کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ جو لوگ شمالی امریکہ سے اس موقع پر یہاں آئے انھیں اصطلاح میں "قالینی ملفوف" (قالین میں لپٹے ہوئے) کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ اپنا تمام مال و اسباب قالین کے سوٹ[1] کیسوں میں رکھ کر اس طرف دوڑے تھے۔ یعنی انھیں لالچ نے اتنا بھی ہوش نہیں لینے دیا کہ وہ اسباب درست طریقے پر بکسوں میں بند کر کے لاتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان حبشی لوگوں کی آزادی اور سدھار سے جتنے لوگ متعلق تھے وہ سب ہی ایسے مطلب پرست تھے۔ ان میں اسکولوں کے ٹیچر بھی تھے جنھوں نے ان پڑھ لوگوں کو پڑھانے کے لئے اپنی خدمات مفت پیش کی تھیں تاکہ یہ لوگ امریکہ کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں۔ کانگریس نے ان کو

---

[1] قالین کے سوٹ کیس سے مراد وہ بستر ہے جس میں تمام ضروری چیزیں رکھ کر اوپر سے بستر بند کے بجائے گھر میں بچھا ہوا قالین ہی لپیٹ دیا جائے گویا سوٹ کیس بھی وہی ہے اور بستر بھی وہی۔ ہندوستان میں بھی اس قسم کے بستر ریل کے سفر میں دیہاتیوں کے پاس دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن قالین کی جگہ کوئی دری یا کمبل ہوتا ہے۔ اس بستر میں ان کے پہننے کے کپڑے بھی ہوتے ہیں۔ ایک آدھ جوڑی جوتے بھی اور اگر پڑھا لکھا ہے تو ایک آدھ کتاب یا رسالہ بھی۔ غرض کل کائنات بستر ہی ہوتا ہے۔ مترجم

مناسب طور پر آباد کرنے کے لئے ایک محکمہ بھی قائم کیا جو ان کے لئے مکانات تعمیر کرنے کے علاوہ ان کے روزگار کا بندوبست کرتا تھا اور اپنے پیروں کھڑا ہونے کے قابل بناتا تھا۔

سنہ ۱۸۷۰ء تک تمام جنوبی ریاستیں ریاستہائے متحدہ میں شامل ہوگئیں لیکن فوجی انتظام برقرار رکھا گیا کیونکہ سابقہ غلاموں اور اُن کے سابقہ آقاؤں میں تلخی بڑھتی جارہی تھی۔ انھوں نے ان حبشیوں کو الیکشن میں ووٹنگ سے محروم رکھنے کے لئے اب ایک اور چال چلی۔ ایک دہشت پسند پارٹی قائم کی جس کا نام "کوکلکس کلان" تھا۔ اس پارٹی کا مقصد ان آزاد شدہ غلاموں کو مارنا، ستانا اور تنگ کرنا تھا تاکہ یہ لوگ شہری اور ملکی معاملات سے کنارہ کش ہوجائیں۔ یہی سلوک ان کے بہی خواہوں اور قالینی ملفوفوں کے ساتھ روا رکھا۔ اور شمالی امریکہ کی تعمیرِ نو کی پالیسی کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے کے لئے تقریباً ایک پشت تک صرف ڈیموکریٹک پارٹی کو ووٹ دیا جو ان کی حمایتی تھی۔

ادھر کانگریس کے ری پبلک ممبران صدر جانسن سے اس قدر ناراض ہوگئے کہ اس پر کانگریس کے پروگرام میں دخل دینے کے الزام میں مقدمہ چلا دیا۔ جانسن سے پہلے اور جانسن کے بعد کوئی صدر ایسا نہیں ہوا جس کو اتنی سخت توہین سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کے لئے جب کانگریس کا اجلاس ہوا تو کانگریس کو دو تہائی ممبروں کی تائید حاصل کرنا ضروری تھی لیکن صرف ایک ووٹ کی کسر رہ گئی اور کانگریس کو چار و ناچار صدر کو برقرار

رکھنا پڑا تا آنکہ صدارت کی میعاد ختم ہو جائے۔ اگرچہ صدر سے کیبنٹ معطل کرنے کے اختیارات چھین لئے گئے تھے مگر کسی نہ کسی طرح جانسن نے اپنے بدترین دشمن سینٹن کو سکریٹری برائے امور جنگ کے عہدے سے ہٹا ہی دیا۔

ری پبلکنوں کو غلامی کے مسئلے پر دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ تھا جو خلوص کے ساتھ جمہوریت کا حامی تھا اور غلامی اور غیر مساوی سلوک کو اس قوم کے لئے ناروا سمجھتا تھا جو ہر فرد کی آزادی کی دعویدار تھی اس لئے یہ طبقہ چاہتا تھا کہ ان سابقہ غلاموں کو بھی وہی حقوق اور اختیارات ملنے چاہئیں جو امریکہ کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں چاہے اس سلسلے میں کچھ عارضی مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ دوسرا طبقہ اس مسئلے کو صرف سیاسی اور اقتصادی نظر سے دیکھتا تھا۔ سیاسی نظریہ تو یہ تھا کہ ان غلاموں کو چونکہ ری پبلکنوں نے آزادی کی نعمت دلائی ہے اس لئے یہ ان کے ممنون ہیں اور ری پبلکنوں کو ہی ووٹ دیں گے اور اس طرح دونوں جگہ شمالی اور جنوبی امریکہ میں ری پبلکن ہی برسر حکومت رہیں گے یعنی ڈیموکریٹک آئندہ نہ آسکیں گے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ری پبلکن انسداد غلامی اور اصلاحات مال کے بڑے پکے مؤید تھے اور ان کو شمال کے صنعتی اداروں کی بھی تائید حاصل تھی۔ اس پارٹی نے صنعت سے اس لئے رابطہ پیدا کیا تھا کہ جنگ کی صورت میں انھیں امداد و اعانت ملے اور وہ لوگ اس لئے آسانی سے ان کی طرف کھنچ آئے کہ سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے وہ خود ڈیموکریٹک پارٹی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ یہ دو جُدا جُدا

خیال تھے لیکن منتہائے مقصد ایک ہی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سولہ سال تک ری پبلکن ہی حکومت پر قابض رہے اور اس عرصے میں شمالی امریکہ کا ہیرو جنرل گرانٹ دو مرتبہ صدارت کر گیا۔ اس کے بعد رتھر فورڈ بی ہیس آیا اور پھر جیمس اے گارفیلڈ صدر منتخب ہوا لیکن اس پر قاتلانہ حملہ ہو گیا اس لئے اس کی جگہ چیسٹر اسے آرتھر نے سنبھالی۔

یہ زمانہ بھاری صنعت کی ترقی کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر لوہے، تیل اور ریل گاڑی کی صنعت بہت زوروں پر تھی۔ بڑی بڑی کمپنیاں قائم تھیں اور تجارت میں برابر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں اور جو آگے نکل جاتی وہ پسماندہ صنعت کو اپنے انتظام میں لے لیتی تھی۔ یہ کمپنیاں اس صنعت کا مال پبلک میں بیچ کر وہ سرمایہ اپنی کمپنی میں لگا لیتی تھیں گویا اس پس ماندہ صنعت کے مالکان کو اپنی صنعت کا حصہ دار بنا لیتی تھیں۔ اس طریقے سے فائدہ یہ تھا کہ کاروبار کو مزید پھیلانے کے لئے سرمایہ مل جاتا تھا اور کئی دماغوں کی قوت اور تجربہ ایک ہی طرف مبذول ہو جاتا تھا یعنی سب مل کر ایک صنعت کی بقا اور ترقی میں لگ جاتے تھے۔ ان کمپنیوں کا انتظام ان کے ڈائریکٹروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ان میں سے کچھ تو مفاد عامہ کا بہت خیال رکھتے تھے اور بڑی ایمانداری سے کمپنی کو چلاتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جن کا مقصد صرف روپیہ گھسیٹنا ہوتا تھا۔

جنرل گرانٹ اگرچہ بہت قابل آدمی تھا لیکن اس کی قابلیت صرف فوجی تھی۔ اسے تجارت اور صنعت سے کوئی علاقہ نہ تھا اور سیاست میں

بھی کوئی خاص سمجھ بوجھ نہ رکھتا تھا اس لئے اکثر صحیح راستہ سے بھٹک کر جذبات میں بہہ جاتا تھا۔ اس کی اس کمزوری سے "فالینی ملفوف" قسم کے بے ایمان سیاست داں اور موٹے موٹے سیٹھ حکومت کے اعلیٰ افسران کو رشوتیں دے کر خوب اپنا اُلو سیدھا کر رہے تھے بلکہ پھاوڑوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ مثلاً مغربی ریل کی کمپنیاں بڑے عروج پر تھیں۔ کانگریس انھیں حکومت سے امدادیں دلواتی تھی اور خوب بڑھاتی تھی۔ "عنایتوں" کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک کمپنی کو چار کروڑ ستر لاکھ ایکڑ زمین اس کی ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ دی گئی تھی۔ اس بخشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کمپنیوں نے اپنی زمین ہر شہر کے شہر روپیہ لے کر آباد کرلیں۔ ان میں کانیں نکلیں تو انھیں کھود ڈالا اور دوسری صنعتیں پھیلا دیں غرضیکہ ان کمپنیوں کے بعض مالک اس قدر صاحب اثر و اقتدار ہو گئے کہ مغربی ریاستوں کے گورنروں کی بھی ان کے آگے کوئی حیثیت نہ تھی۔

ریلوں کا جال ۱۸۶۹ء میں پھیلانا شروع کیا گیا تھا اور پہلی ریل نیویارک اور سان فرانسسکو کے درمیان چلائی گئی۔ ریل کی صنعت میں شمالی امریکہ سے جنوبی امریکہ تک ریلوے لائن بچھانا تاریخی کامیابی ہے کیونکہ راستے میں صحرا بھی آئے، پہاڑ بھی آئے اور اُجڈ ہندوستانیوں کا علاقہ بھی جہاں سیکڑوں میل تک بستیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن یہ کام جتنا عظیم الشان تھا اتنی ہی بڑی بدنامی بھی ساتھ لایا۔ اس لائن کے بنانے والوں نے ایک کمپنی کریڈٹ موبائیلر کے نام سے بنا رکھی تھی اور معمولی حصہ داروں

کا روپیہ مار کر بے اندازہ دولت کمائی تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر انھیں یہ ڈر ہوا
کہ کانگریس کہیں ان کی بے ایمانیوں کی تحقیقات شروع نہ کردے۔ چنانچہ
اُنھوں نے چوٹی کے ممبران کانگریس کو بھاری بھاری رشوتیں دیں یہاں تک
کہ ریاستہائے متحدہ کے نائب صدر کو بھی کمپنی کے سرمائے کا شریک بنالیا۔
جب یہ رشوتیں منظرِ عام پر آئیں تو لوگ حیران رہ گئے کہ حکومت میں اتنی
زبردست رشوت خوری بھی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سی سیاسی
شخصیتیں اندھیرے اور گمنامی کے غار میں لڑھک گئیں۔

اوپر کی مثال سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ سارے ہی کارخانے والے
بے ایمان تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو انتہائی قابل اور دیانت دار تھے مثلاً
اینڈریو کارینگی جو فولاد کا بادشاہ کہلاتا ہے بہت ہی ایماندار تھا۔ وہ پہلا آدمی
تھا جس نے لوہے کی صنعت کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ کارینگی نے
سب سے پہلے پٹسبرگ میں کارخانہ کھولا تھا کیونکہ یہ کوئلہ سپلائی کرنے والے
علاقوں کے وسط میں واقع تھا اور کوئلہ ہی اس صنعت کی سب سے بڑی ضرورت
ہے۔ کارینگی اپنے ہی جہازوں میں لیک سپیریر کے مغربی حصّوں سے خام لوہا
لاتا تھا اور تیار لوہا اپنی ہی ریلوں میں لاد کر امریکہ کے تھوک فروشوں تک
پہنچاتا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں کارینگی نے اپنے حقوق یونائیٹڈ اسٹیٹس سٹیل کارپوریشن
کے ہاتھ ڈیڑھ ارب ڈالر میں بیچ دیئے۔ یہ رقم اس سے بھی زیادہ تھی جتنی
سو برس پہلے پورے ملک کی فولاد کی صنعت میں لگی ہوئی تھی۔ اس طرح
جان راک فیلر نے ۱۸۵۹ء میں سب سے پہلے زمین کھود کر تیل نکالا۔

اور سخت محنت اور اپنی قابلیت سے کام کو چند ہی دنوں میں اس قدر پھیلالیا کہ تیل کے دوسرے تاجر ششدر رہ گئے۔ اس کی فرم کا نام اسٹینڈرڈ آئل کمپنی تھا۔ باربرداری کا تمام کام ریلوں سے پڑتا تھا اس لئے ریلوے کمپنیوں سے اس نے کرایہ کی کمی کا مطالبہ کردیا اور دھمکی دی کہ اگر اُنھوں نے کرایہ نہ گھٹایا تو وہ ان سے کاروبار بند کردے گا۔ اس کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ریلوے کمپنیوں کو مجبوراً اس کا کہنا ماننا پڑا۔ دوسرے تاجروں نے اس خصوصی رعایت کے خلاف احتجاج کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ریلوے والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر سارے تاجر بھی ان سے ٹوٹ جائیں تو تینتیس سالہ راک فیلر کی تجارت ہی اتنی بڑی ہے کہ ان کی آمدنی میں فرق نہ آنے دے گی۔ آخر حریفوں نے مجبوراً اپنے اپنے کاروبار اس کے ہاتھ فروخت کردیا۔

اسی قسم کی حیران کن ترقیاں اور لوگوں نے دوسری صنعتوں میں بھی کیں اور ہر صنعت اسی طرح عظیم سے عظیم تر ہوتی چلی گئی۔ گوشت سربند کرنے کی صنعت تو حال ہی کی ہے یعنی اس وقت شروع کی گئی تھی جب ریلوں میں ریفریجریٹروں کا انتظام ہوگیا تھا۔ اس پر بی سوفٹ اور پی ڈی آرمر چھائے ہوئے تھے۔ اسی طرح تمباکو، شکر، شراب، ربر اور تانبے کی صنعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان تجارتوں میں روپیہ لگانے کے لئے بڑے بڑے بنک قائم تھے اور ان سب بنکوں کو جے پی مورگن کا بنک قرض دیتا تھا۔ تجار روپیہ سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے اور موجد ان کے لئے نئی

نئی چیزیں ایجاد کر رہے تھے۔ دخانی کشتیاں، ریلوے انجن، تار برقی اور فصل کاٹنے کی مشین تو انیسویں صدی کے شروع ہی میں ایجاد ہو چکی تھیں اب اس فہرست میں ٹیلیفون کا اور اضافہ ہو گیا۔ جس کو الیگزینڈر گراہم بیل نے ۱۸۷۶ء میں ایجاد کیا۔ گراہم بیل سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا اور امریکہ میں آکر بس گیا تھا۔ بجلی کا بلب اور بجلی بنانے کی مشین ۱۸۸۲ء میں تھامس اے ایڈیسن نے ایجاد کی جس سے شہر جگمگا اُٹھے اور بھاری بھاری مشینیں صرف ایک اُنگلی سے بٹن دبا دینے پر حرکت میں آگئیں۔ دور و نزدیک ٹیلیفون سے جڑ گئے۔ غرضیکہ صنعتوں کو بڑی ترقی ہوئی اور قوم کا معیار زندگی بہت بہتر ہو گیا۔

اسی صنعتی انقلاب سے امریکی عوام پر بہت گہرا اثر پڑا اور بہت دور رس نتائج پیدا ہوئے۔ ان تاجروں میں کچھ لوگ لالچی تو تھے مگر سمجھدار اور دور بین بھی تھے۔ انھوں نے اس قدر مال بازاروں میں لا کر ڈال دیا جیسے مال کا سیلاب آگیا ہو۔ معاشیات کا اصول ہے کہ رسد جتنی بڑھتی جائے گی مانگ اتنی ہی گھٹتی جائے گی اور بازاروں پر جمود سا طاری ہوتا چلا جائے گا اور آخر آہستہ آہستہ عوام کی قوتِ خرید ختم ہو جائے گی۔ یہی حال امریکہ کے دیہاتوں میں ہوا۔ بیچارے دیہاتیوں پر اس اصول کا اثر جلد ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا اور وہ افلاس کی طرف بڑھنے لگے لیکن صنعت کی حیرت انگیز ترقی سے چونکہ مزدوروں کی مانگ بڑھ گئی تھی اس لئے لوگ دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں آنے

لگے اور افلاس خوشحالی میں بدلتا چلا گیا۔ مگر جیکسن کے وقت میں بازار کی حالت برابر گر رہی تھی اس لئے بنکوں کے مالکوں نے صنعتوں کی مزید توسیع کے لئے آنے والے خطرے کے پیش نظر روپیہ دینا بند کر دیا۔ اس اقدام سے ۱۸۷۳ء میں پوری قوم کا اقتصادی ڈھانچہ ڈانواڈول ہو گیا۔ کارخانوں میں مزدوروں کی کھپت کم ہو گئی اور پانچ سال تک عام بیکاری کا دور دورہ رہا۔ لیکن ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک ملک کی معاشی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی کہ ۱۸۹۰ء کے بعد پھر بگڑنی شروع ہو گئی۔

۱۸۷۳ء کا بحران اس وقت آیا تھا جب جنرل گرانٹ کی دوسری صدارت کا دور شروع ہو رہا تھا۔ گرانٹ اپنی پہلی صدارت میں بھی حکومت کے اعلیٰ افسران کی خرابیاں دُور کرنے میں ناکام رہا تھا حالانکہ اس کی اپنی پارٹی کے ممبر بھی ان میں ملوث ہو رہے تھے اس لئے ان بڑھتی ہوئی خرابیوں کا ۱۸۷۶ء کے الیکشن پر اثر پڑا اور ری پبلکن نمایندہ آر۔ بی ہیس اپنے ڈیموکریٹک حریف سیموئل ٹلڈن کے مقابلے میں ناکام ہو گیا۔ کیونکہ ڈیموکریٹوں نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ اگر ان کا نمایندہ کامیاب ہو گیا تو وہ ان تمام بُرائیوں کو ختم کر دے گا۔ ٹلڈن کو ڈھائی لاکھ ووٹوں سے کامیابی ہوئی مگر جنوب کی تین ریاستوں کیرولینا، فلورڈا اور لوسینیا کے ووٹوں میں کچھ جھگڑا پڑ گیا اور دوبارہ ووٹنگ ہوئی اور ہیس ہاری ہوئی بازی جیت گیا۔

ہیس کا دورِ حکومت امریکہ کی تاریخ میں سب سے عمدہ اور

سب سے صاف رہا ہے اس کے باوجود بھی لوگ اس کی زیادہ تعریف نہیں کرتے کیونکہ صدر بنتے ہی اس نے جنوبی امریکہ سے فوجیں واپس بلالیں اور اس طرح ڈیموکریٹوں کو گویا کھلا چھوڑ دیا۔ اس سے اس کی اپنی پارٹی ناراض ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ اعلیٰ افسران کی خرابیاں دور کرنے کے لئے ایسے بہت سے لوگوں کو ملازمتیں دیدیں جنھوں نے اسے ووٹ دلائے تھے۔ داخلی امور کا محکمہ چند بہت ہی گرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو بکس ہندوستانیوں کو لوٹتے تھے اور انھیں زمینوں سے محروم کر رہے تھے۔ جب اس محکمہ کی طرف اس نے توجہ کی تو پارٹی کی حمایت سے بالکل ہی محروم ہوگیا اور دوبارہ صدر منتخب نہ ہوسکا۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں جنرل گارفیلڈ نے پھر ڈیموکریٹک امیدوار کو شکست دی لیکن صدارت سنبھالتے ہی کسی دل جلے نے جو حکومت میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا اسے گولی سے اڑا دیا۔ نائب صدر چیسٹر آرتھر کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا جس نے نظام حکومت بہتر بنایا۔ اور سول سروس کے لئے معیار صرف قابلیت کو قرار دیا۔ ملک میں چونکہ اس وقت بدعنوانیوں کا زور تھا اس لئے کوئی بھی اصلاحی قدم مخالفین کی تعداد میں اضافہ کرتا تھا۔ یہی آرتھر کے ساتھ ہوا کہ جب اس نے سول سروس میں دھاندلی اور سفارش کو ختم کیا تو اس کی اپنی ہی پارٹی اس سے ناراض ہوگئی اور اسے دوبارہ صدارت کے لئے موقع نہ دیا اور سنہ ۱۸۸۴ء کے

الیکشن میں جیمس بلین کو ری پبلکن نمائندہ نامزد کیا گیا۔ ڈیموکریٹوں نے اس دفعہ الیکشن جیتنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن پادری ری پبلکن پارٹی کے حق میں تھے اور ڈیموکریٹوں کو "شراب، سفریت اور شوریدہ سری" کا مجموعہ بتاتے تھے لیکن اس کے باوجود جیمس بلین کامیاب نہ ہو سکا اور ڈیموکریٹ نمائندہ کلیولینڈ جیت گیا۔

ری پبلکن پارٹی کے مذکورہ دورِ حکومت میں تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا اور قوم کو مادی اعتبار سے کافی ترقی ہوئی۔ ہر قابل تاجر کو اُبھرنے اور کمانے کا موقع ملا۔ خوشحالی کا دور دورہ ہوا اور امریکہ ایک عظیم صنعتی ملک بن گیا ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان تجارت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی ایسا عروج دوبارہ نصیب نہ ہو سکا۔ ان ترقیوں اور تبدیلیوں نے لوگوں کا طریق زندگی تو بدلا ہی تھا ان کا طرزِ فکر بھی بدل دیا۔

امریکہ کے مزدور سالوں سے اس کوشش میں تھے کہ متحد اور منظم ہو جائیں کیونکہ عام طور پر مزدور کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی تھی اور کارخانوں کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ نہ ان میں مناسب ہوا کا انتظام تھا نہ روشنی کا۔ اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے مزدوروں کا کوشش کرنا ایک قدرتی بات تھی۔

مزدوروں کی پہلی تنظیم "نائیٹس آف لیبر" کے نام سے ۱۸۶۹ء میں ہوئی اس جماعت میں ہر صنعت اور ہر کارخانے کا مزدور شامل ہو سکتا تھا۔ اس جماعت نے مطالبہ کیا کہ مزدور سے ایک دن میں آٹھ گھنٹے سے

زائد کام نہ لیا جائے اور بچوں کو کارخانوں میں بھرتی نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے عام سہولتوں کے لئے بھی ایک پروگرام بنایا۔ یہ جماعت بڑی تیزی سے مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۶ء میں اس کے ممبروں کی تعداد سات لاکھ سے بھی اوپر پہنچ گئی لیکن یہ موثر ہڑتال کرانے میں ناکام رہی کیونکہ اس کا نظم و ضبط کمزور تھا دوسرے یہ کہ یہ اسی بات پر آواز اُٹھاتی تھی جس کا تعلق اکثریت سے ہوتا تھا۔ انفرادی تکلیفوں پر توجہ نہیں کرتی تھی اس لئے یہ جماعت زیادہ نہ جی سکی۔

اس جماعت کے ختم ہوجانے کے بعد ہر صنعت کے مزدوروں کی الگ الگ یونین قائم ہوئی لیکن سیموئل گومپر (سگار والے) نے ان سب کو متحد کرکے ایک مرکز کے ساتھ منسلک کردیا۔ گومپر نے مزدوروں میں ایسی مقبولیت حاصل کی کہ اس کا نام آج تک زندہ ہے۔ اس متحد جماعت کا نام گومپر نے امریکن فیڈریشن آف لیبر رکھا تھا جو آج بھی قائم ہے۔ اس فیڈریشن نے سرمایہ دارانہ نظام کی تو حمایت کی لیکن مزدوروں کے لئے اچھی اُجرت اور کام کے مناسب اوقات کے علاوہ بونس کا مطالبہ کیا۔ یعنی کارخانے دار اپنے نفع کا ایک حصّہ اپنے مزدوروں میں تقسیم کریں۔

امریکی سماج میں صرف مزدوروں کی جماعتیں ہی نہیں تھیں جو تجارت اور صنعت کی دھاندلیوں کے خلاف آواز اُٹھاتی تھیں بلکہ مغربی سرحدی علاقوں میں عوام بھی ان خرابیوں پر احتجاج کرتے تھے جن کا اثر ان کی جیبوں پر پڑتا تھا۔

سنہ ۱۸۷۰ء کے قریب زراعت پیشہ لوگوں نے اپنی ایک جماعت بنالی کیونکہ ان کو اپنا مال لانے لیجانے کے لئے ریلیں ہی مل سکتی تھیں اور ریلوں میں یہ حال تھا کہ راک فیلر جیسے تاجر تو کم کرایہ دیتے تھے لیکن چھوٹے چھوٹے تاجروں کو زیادہ کرایہ دینا پڑتا تھا۔ اس لئے اس جماعت کے تقریباً دولاکھ ممبروں نے حکومت سے قانونی امداد کا مطالبہ کیا اور چند ریاستوں نے ان کے مطالبے پورا کرنے کے لئے قانون بنا بھی دیئے۔ ظاہر ہے کہ کسی ریاست کا بنایا ہوا قانون اس ریاست کی حدود کے اندر ہی لاگو ہوسکتا ہے۔ دوسری ریاستیں اس کے ماننے کی پابند نہیں ہیں حالانکہ یہ مطالبہ پورے ملک سے متعلق تھا۔ آخر ۱۸۸۷ء میں مرکزی حکومت نے بین الریاستی تجارت کا قانون پاس کردیا۔

دوسری انجمن مغرب کے علاقوں میں سکّے کی قیمت میں کمی تھی۔ مشرق میں تو بنکوں کی وجہ سے سکہ کی قیمت برقرار تھی کیونکہ وہاں سونا سکّے کی ضمانت میں موجود تھا اس لئے ساکھ بنی ہوئی تھی۔ مغربی لوگوں نے مجبوراً مشرق سے روپیہ قرض لیا تاکہ وہ اپنے کاروبار کو پھیلاسکیں لیکن اس قرض کی ادائیگی انھیں سونے میں کرنی پڑتی تھی۔ اگر کہیں کاغذ کا سکّہ ہی واپس دینا ہوتا تو ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ کاغذ کے سکے کی بہتات نے ہی تو سکّے کی قیمت گرادی تھی۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے انھوں نے ایک تدبیر نکالی۔

پہلے پہل امریکہ میں صرف سونے اور چاندی کا سکہ چلتا تھا اور سولہ

اونس چاندی ایک اونس سونے کے برابر خیال کی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ ان دھاتوں کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں اس لئے جب دھات کا بھاؤ تیز ہوتا تھا وہی غائب ہو جاتی تھی کیونکہ عوام بجائے سرکاری قیمت لینے کے سکّے کو صرافوں اور جوہریوں کے ہاتھ بیچ کر زیادہ رقم وصول کرتے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں ایسا ہی ہوا۔ چاندی کی قیمت بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ہی مغرب سے چاندی کا سکّہ بالکل غائب ہو گیا۔ آخر حکومت کو چاندی کا سکّہ بند کرنا پڑا کیونکہ اسٹاک میں چاندی نہیں تھی کہ مزید سکّہ بنایا جاتا اس کے کچھ ہی عرصے بعد مغربی علاقوں میں چاندی کی بڑی بڑی کانیں دریافت ہو گئیں۔ ان کی دریافت سے چاندی کی قیمت گر گئی۔ کان کے مالکوں نے گرے بھاؤ پر چاندی بیچنے سے زیادہ اس کی کوشش کی کہ چاندی کا سکّہ پھر رائج ہو جائے تاکہ ان کی چاندی کی مناسب قیمت مل سکے۔ کسانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ۱۸۹۰ء میں "شیرمین سلور پرچیز ایکٹ" پاس ہو گیا۔

کلیولینڈ نے ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ پر ۱۸۸۴ء اور ۱۸۹۲ء کے دو الیکشن جیتے امریکہ کا وہ پہلا صدر تھا جو اپنی پہلی صدارت کے بعد حزب مخالف سے ہار گیا لیکن چار سال بعد پھر منتخب ہو کر آیا۔ وہ بہت ہی لائق منتظم تھا اور جو کچھ سوچ لیتا تھا وہی کرتا تھا۔ اس کی پالیسی میں لچک بالکل نہیں تھی چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ حالانکہ ری پبلکنوں نے بہت شور مچایا مگر ڈیموکریٹ جن کا وہ نمائندہ تھا وہ بھی اس پر ناراض ہو گئے

کہ اُس نے ایک ری پبلکن کو سول سروس کے ایک بہت اونچے عہدے پر مقرر کر دیا۔ وہ مصر تھا کہ خانہ جنگی کے زمانے میں خدمات کی پنشن صرف انھیں لوگوں کو دی جائے جو واقعتاً مستحق ہوں۔

کلیولینڈ کی پہلی صدارت کے دور میں سب سے بڑی اُلجھن یہ تھی کہ سرکاری خزانے میں ملک کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کی وجہ سے دولت کے انبار لگتے چلے جا رہے تھے ان کو خرچ کہاں اور کس طرح کیا جائے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ سارے سرکاری قرضوں (بانڈ وغیرہ) کا روپیہ بے باق کر دیا جائے لیکن اس طرح سکے کا پھیلاؤ اور گردش اس قدر بڑھ جانے کا اندیشہ تھا کہ قابو سے باہر ہو جائے اور لازمی طور پر سکے کی قیمت پر اثر انداز ہو۔ دوسرا طریقہ ذاتی شان وشوکت پر خرچ کرنے کا تھا مگر کلیولینڈ سخت جمہوری دماغ کا تھا اس لئے اسے مناسب نہ سمجھتا تھا۔ لے دے کے اب یہی ایک طریقہ رہ گیا کہ ٹیکس گھٹا دیئے جائیں۔ لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود ٹیکسوں کی شرح کم کرنے میں اسے کامیابی نہ ہوئی اور اس مسئلے پر اتنی تلخی بڑھی کہ ۱۸۸۸ء میں اسے صدارت ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔۔۔ اور اس کی جگہ ری پبلکن امیدوار بنجمن ہیریسن کامیاب ہو گیا۔

ری پبلکنوں نے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ٹیکسوں کی شرح میں مزید اضافہ کر دیا اور اضافے سے حاصل شدہ رقم کو جنگ کی پنشنوں اور پبلک کی سہولتوں پر خرچ کیا۔ بحری طاقت کو بھی اسی سے بڑھایا لیکن ان باتوں سے قوم کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ سونا جس پر قومی

اقتصادیات کا سارا محل کھڑا ہوا تھا دن بدن کم ہونے لگا۔ بنک فیل ہونا شروع ہو گئے۔ کمپنیوں میں لگے ہوئے سرمائے کی شرح گھٹنے لگی۔ اب لوگوں کو کلیولینڈ پھر یاد آیا اور ۱۸۹۲ء کے الیکشن میں عوام نے اسے پھر صدارت کے لئے منتخب کرلیا۔ اس الیکشن میں ایک نئی پارٹی "پیپلز پارٹی" کے نام سے پیدا ہوئی اور دس لاکھ سے زیادہ ووٹ حاصل کرکے ری پبلکن اور ڈیموکریٹ دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ پبلک کے سامنے بڑا اصلاحی پروگرام پیش کیا مگر عوام تو کلیولینڈ کو ہی لانا چاہتے تھے اور آخر وہی صدر منتخب ہوا۔

کلیولینڈ نے قوم کی بنیادیں مضبوط کرنے کی پوری پوری کوشش کی اگرچہ بنکوں کے کرتا دھرتا جے پی مورگن سے اس کے ذاتی تعلقات نہ تھے تاہم خزانے میں سونے کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے مورگن سے بانڈ پر سونا قرض لے لیا۔ اس طرح عوام میں اس کی اور عزت بڑھی۔ مگر ملک کے کسان اور مزدور اس قدر بیدار ہو گئے تھے کہ انھیں حکومت کا ہر قدم سرمایہ داروں کی موافقت میں ہی بڑھتا نظر آتا تھا۔ حتیٰ کہ دستور کی چودھویں ترمیم جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ریاست کسی فرد کو زندگی، آزادی اور جائداد سے بغیر قانونی چارہ جوئی کے محروم نہیں کرسکتی اور چونکہ کارپوریشن اور کمپنیوں کو افراد کی حیثیت دی گئی تھی لہذا یہ نئے نئے بیدار شدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس دفعہ کی رو سے مرکز نے ان کو تمام قیود سے آزاد کر دیا ہے اسی لئے تو مرکز کی حکومت کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیتی۔

۱۸۹۶ء کے الیکشن تک یہ تمام غلط فہمیاں اور ان کے نتائج اپنے شباب پر پہنچ گئے اور حالات اس قدر ابتر ہو گئے کہ کلیو لینڈ جیسا بیدار مغز انسان بھی ملک کو دیوالیہ پن سے بچانے میں ناکام نظر آنے لگا۔ اتنے ہی میں الیکشن آپہنچا۔ ری پبلکنوں نے ولیم میک کنلی کو اپنا نمائندہ نامزد کیا اور اصلاح حال کے لئے تجویز کیا کہ سکّے کی بنیاد سونا ہونا چاہئے کیونکہ چاندی نے کم قیمت ہونے کی وجہ سے ملک کے سکّے کی قدر گھٹا دی ہے اور کام کاج کا چلنا مشکل کر دیا ہے اور اگر ایک دفعہ ملک اس بھنور سے نکل جائے تو خوشحالی ہی خوش حالی ہے۔

ڈیمو کریٹ بھی شکاگو میں مل کر بیٹھے اور کلیو لینڈ کی کوتاہیوں پر غور کیا اکثریت کا یہ خیال تھا کہ کلیو لینڈ بڑی بڑی کمپنیوں اور اداروں کا دوست ہے ان کو نوازتا ہے اور چھوٹے آدمیوں (معمولی دوکاندار کسان اور مزدور وغیرہ) کا گلا کاٹتا ہے اس لئے اس مرتبہ انھوں نے ولیم جیننگ برایان کو صدارت کا امیدوار نامزد کیا۔ چھتیس سالہ برایان بہترین مقرر تھا۔

اس الیکشن کی دلچسپیاں امریکہ کی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ پیپلز پارٹی ڈیمو کریٹوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی اور ڈیمو کریٹ بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ جنوبی باشندے ڈیمو کریٹوں کو ووٹ دینے کی قسمیں کھاتے پھرتے تھے۔ برایان کی چمکدار تقریریں چاندی کی طرح بڑی چمک رہی تھیں۔ ادھر ری پبلکن بھی اپنی سی کر رہے تھے۔ برایان کی تقریروں کا

جواب دیتے جاتے تھے اور ڈالر پانی کی طرح بہاتے جاتے تھے۔ غرضیکہ سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ ویسے کنیڈی خود بھی نہایت قابل، سمجھدار اور تجربہ کار آدمی تھا اور پھر بریان کا زور توڑنے کے لئے اٹھارہ ہزار مقررین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو چپے چپے پر کنیڈی کے گُن گاتے پھرتے تھے۔ قصہ مختصر الیکشن کا دن آیا۔ لوگ جوق در جوق ووٹ دینے کے لئے گئے اور کل ایک کروڑ تیس لاکھ ووٹ پڑے۔ کنیڈی کو ستر لاکھ اور اُس کے حریف کو ساٹھ لاکھ ووٹ ملے۔ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو مشرق والوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مغرب والوں پر اداسی سی پڑ گئی کیونکہ مشرق والے کہتے تھے کہ سکے کا معیار سونا ہونا چاہئے اور مغرب والوں کا خیال تھا کہ سکے کا معیار چاندی پر قائم کیا جائے۔

آٹھواں باب

دُنیا کی عظیم طاقت ۔ امریکہ

لوگ حیرت سے تکتے تھے اور گھوڑے ڈر کے مارے بدک جاتے تھے جب کوئی بغیر گھوڑے کی گاڑی امریکہ کی سڑکوں پر نکل جاتی تھی۔ یہ بہت آہستہ چلتی تھی اور کچھ عجیب بےتُکی سی معلوم ہوتی تھی۔ عام لوگ یہ سمجھتے تھے کہ امیروں کے دل بہلاوے کی کوئی چیز ہے اور کسی کو خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ جب شیشے کی بنی ہوئی اسی قسم کی گاڑیاں امریکہ کی شاہراہوں پر دوڑتی پھریں گی اور یہ کہ اتنی کثرت سے ہوں گی کہ ان کی اوسط ہر چار امریکیوں پر ایک گاڑی کا ہو جائے گا۔ یہ خیال بھی کسی کو نہ آسکتا تھا کہ امریکہ کے اس کنارے سے اس کنارے تک سیمنٹ کی بنی ہوئی شفاف سڑکوں کا جال بن جائے گا اور شہروں کی آبادیاں میلوں تک نکل جائیں گی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ دور دراز علاقوں

میں پڑے ہوئے کسان کار کے ذریعے صرف چند گھنٹوں میں شہر آ جا سکیں گے اور پوری امریکی قوم پہیوں پر سوار ہو جائے گی۔

ترقی کی ایک اور حیرت انگیز منزل آئی۔ کٹی ہاک (شمالی کیرولینا) میں رائٹ برادران نے ایک عجیب سی چیز میں زمین سے بلند ہو کر انسان کی ایک دیرینہ خواہش کو پورا کر دیا۔ اس چیز کا نام بعد میں ہوائی جہاز رکھا گیا اور چند ہی سالوں کے بعد ہوائی جہاز یورپ کی آسمانی فضاؤں میں لڑتے ہوئے نظر آئے اس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں کے مسافروں کو لادے پھرنے لگے۔

ایک اطالوی نوجوان گیگلمو مارکونی نے یورپ سے امریکہ بغیر تاروں کی مدد کے پیغام بھیجا اور یہی ریڈیو کی پیدائش کی ابتدا تھی۔ تھامس ایڈیسن نے تصویر کشی کے لئے کیمرہ مکمل کر لیا جس کی مدد سے دنیا آج چلتی پھرتی تصویریں دیکھتی ہے۔ مشین کے ماہروں نے کرین بنا ڈالی جس کی مدد سے بڑے بڑے شہروں میں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں نظر آنے لگیں ان میں سے بہت سی ایجادوں کا سہرا امریکہ کے سر ہے لیکن ان میں دوسروں کا بھی حصہ ہے۔ بہر حال ۱۹۰۰ء کے بعد ان ایجادوں نے امریکہ کی کایا پلٹ دی اور اس کو وہ حُسن اور نکھار عطا کیا جو آج آپ دیکھتے ہیں۔

امریکہ کا چشم زدن میں دنیا کی عظیم طاقت بن جانا بالکل یقینی بلکہ ناگزیر تھا کیونکہ امریکی چین سے نہیں بیٹھ سکتے ان میں اُبھرنے اور ترقی کرنے کی لگن ہے اپنے ملک سے باہر نکل کر بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام

دیئے ہیں۔ مغربی سرحد کے بند ہونے سے پہلے (سنہ ۱۸۹۰ء کے قریب) وہ ترقی کرنے اور کوئی نئی چیز دُنیا کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے اپنی سرحدوں کے پار بھی نکل جاتے تھے۔ مثلاً سنہ ۱۸۵۳ء میں جاپان جانے کے لئے اُنھوں نے بحری راستہ تلاش کیا اور دنیا کے لئے تجارت کی ایک نئی منڈی کھول دی۔

گذشتہ صدی کے آخر میں دنیا کی قوموں نے بین الاقوامی تجارت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانی چاہی۔ امریکی قوم بھی اس مقابلے میں شامل ہوئی۔ یہ پہلے بتا دینا مناسب ہے کہ یوروپ کی طرح تجارت کے بہانے امریکہ دوسرے ملکوں پر قبضہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دوسروں کو بھی اسی طرح خوش حال اور بے فکر دیکھنا چاہتا تھا جیسے وہ خود تھا۔

اس کے قریب کے سمندر پر غیر اقوام کا اقتدار کافی بڑھ گیا تھا۔ اور فرانس تو بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کو ملانے کے لئے بحیرہ کریبین پہ نہر پانامہ بنانے کے متعلق منصوبہ بنا رہا تھا۔ لیکن امریکی ایسی معمولی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ البتہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ مگر نہر کے بن جانے کا مطلب یہ تھا کہ امریکی اپنی زمین پر غیروں کو قدم جمانے کی اجازت دے رہے ہیں۔ لہذا ہر امریکی کے دل میں قدرتی طور پر دو سوال پیدا ہوئے کہ کیا ہم یوروپ کو اپنے علاقے میں قدم جمانے دیں اور چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہیں۔ کیا ہم اس طرح غیروں کے اقتدار میں گھر جانے کے بعد محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اسپین کی مثال نے ان سوالوں کو اور

روشن کر دیا۔ کیوبا اسپین کے قبضے میں تھا اور اس کا فلورڈا سے کل پچانوے میل کا فاصلہ تھا۔ ہسپانوی یہاں بہت سختی کے ساتھ حکومت کرتے تھے ان کی سختی سے تنگ آکر یہاں کے باشندے ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسپین نے ان کو دبانے کے لئے دو لاکھ فوج اس جزیرے میں لاکر اُتار دی اور بہت خونریزی کی۔ اس مصیبت میں ان امریکیوں کی بھی آفت آئی جو کیوبا میں آباد تھے اس پر صدر میک کنلی نے اس خونریزی اور بربادی کو روکنے کی کوشش کی لیکن ہسپانویوں نے اسے نہایت روکھا جواب دیا کہ "اپنا کام کرو۔ دوسرے کے معاملات میں دخل مت دو"۔ اس سے امریکی قوم کے جذبات کو بُری طرح ٹھیس لگی اور اخبارات نے اسے جلی سرخیوں میں شائع کیا۔ عوام نے اخبارات میں جب امریکہ کے ایک جنگی جہاز کے ڈبوئے جانے کی خبر پڑھی تو ہر طرف سے اعلان جنگ کا مطالبہ ہونے لگا۔ لیکن یہ جہاز کیسے ڈوبا اور کس نے ڈبویا یہ آج تک پردۂ راز میں ہے۔ جب کیوبا کے عوام نے سر ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کیا تو ہسپانویوں کے ہوش ذرا ٹھکانے لگے اور انھوں نے امریکہ کی خواہش کے مطابق فوجی کارروائی بند کر دی مگر امریکیوں نے اپنا مطالبہ جاری رکھا کہ جنگ کی جائے اور کیوبا کے باشندوں کو ان ظالم آقاؤں سے نجات دلائی جائے۔

۱۸۹۸ء میں یہ جنگ نہایت تیزی کے ساتھ چھڑی۔ امریکہ کا ایک بحری جہاز برطانوی بندرگاہ ہانگ کانگ (چین) سے چلا اور فلپائن ہوتا ہوا منیلا پہنچا جہاں اس کی ایک ہسپانوی بحری بیڑے سے ٹکر ہوئی۔ امریکیوں

نے ہسپانوی بیڑہ مکمل طور پر تباہ کر دیا اور اپنا ذرا بھی نقصان نہ ہونے دیا۔ادھر امریکن دستے کیوبا میں داخل ہو گئے اور ہسپانوی فوج کو بُری طرح شکست دی۔ بحیرہ کریبین کے تمام ہسپانوی جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں کل تین مہینے لگے۔

جنگ کے خاتمے پر امریکہ کے سامنے دو سوال تھے اول یہ کہ کیا کیوبا کے علاوہ باقی تمام جزیرے اسپین کو واپس کر دیئے جائیں یا سب کو امریکی نوآبادیات کے بطور قبضے میں رکھا جائے۔ اس پر بہت بحث ہوئی۔ کچھ کا خیال یہ تھا کہ اتنے دور اُفتادہ مقامات کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی جا سکتی اور یہ امریکہ کے بُنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ دوسروں کا مشورہ تھا کہ ان کو واپس کر کے ان جزیروں کے باشندوں کو پھر ہسپانوی ظالموں کے حوالے نہ کیا جائے اور آخر صدر کنلی نے موخرالذکر مشورے کو قبول کر لیا اور کیوبا میں امریکہ کے ماتحت ایک آزاد جمہوری حکومت قائم کر دی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں جزیرہ ہوائی کو امریکی بستی قرار دے دیا۔ کیونکہ اس میں امریکی تاجر اور مذہبی مبلغ آباد تھے۔

جب امریکی فوج نے منیلا پر قبضہ کیا تھا تو فلپائن بے یار و مددگار رہ گیا تھا لہذا فوج نے لگے ہاتھ اسے بھی ہسپانویوں سے چھین لیا تھا۔ اس زمانے میں وہاں کے باشندے اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے اور جب یہ امریکہ کے تسلط میں آ گیا تو اب ان کی لڑائی کا رُخ اسپین کے بجائے امریکہ کی طرف ہو گیا۔ بہت عرصے تک وہ گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ آخر

امریکہ نے پچاس ہزار جوانوں کی جمعیت بھیج کر ان پر قابو پایا۔ اسی اثناء میں امریکہ چین میں جا پھنسا کیونکہ چینی قوم یورپین اقتدار کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اور چینیوں کی ایک جماعت "باکسر" (گھونسے باز) غیر ملکیوں کو نکالنے کے در پے ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پیکنگ میں برطانوی سفارت خانے کا محاصرہ کر لیا تھا جس کو بین الاقوامی فوج نے توڑا۔ اس فوج میں فلپائن میں پڑے ہوئے امریکی دستے بھی شامل تھے۔ اس کے بعد چین اور امریکہ میں گہری دوستی ہو گئی اور جب چینی حکومت کو مجبور کیا گیا کہ وہ گھونسے بازوں کے پہنچائے ہوئے نقصان کا تاوان ادا کرے تو امریکہ نے اس کی مدد کی اور چین کو نہتا کرنے کی پالیسی میں دخل دے کر اسے نقصان عظیم سے بچایا۔

۱۹۰۵ء وہ مبارک سال تھا جب امریکہ خوشحالی اور ترقی کی گود میں کھیل رہا تھا اس کی دولت، بے فکری، عیش و نشاط کا اندازہ نہ تھا کوئلہ، لوہا اور غلّہ کافی سے زیادہ پیدا ہو رہا تھا اور پھر بھی پیداوار میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ تجارت کا یہ حال کہ برآمد درآمد سے کئی گنا بڑھی ہوئی تھی۔ الاسکا کی سونے کی بڑی بڑی کانوں نے سکّے کی ساکھ بڑھا دی تھی اور لوگ دل کھول کر لین دین کرتے تھے۔ ان حالات میں صدر میک کنلی کا دوبارہ صدر منتخب ہو جانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ مقابل پھر وہی ڈیموکریٹک نمائندہ ولیم بریان تھا جو ملکی ترقی کے تیز بہاؤ کے آگے نہ ٹک سکا۔

صدر میک کنلی کا نائب تھیوڈور روزولٹ تھا جو امریکہ کی تاریخ کی زندہ دل ہستیوں میں سے ایک تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا مگر صحت بنانے کا بڑا شوقین تھا اسی لئے مغرب کے خوشگوار علاقوں میں کئی سال تک گوالا بنا رہا اور جب امریکہ کی اسپین سے جنگ ختم ہوگئی تو اپنی ذہانت اور قابلیت کے بل پر نیویارک کا گورنر منتخب ہوا اس اہم عہدے پر اس قدر دیانتداری سے کام کیا اور ایسی اصلاحات کیں کہ غلط کار گھبرا اُٹھے۔ حد تو یہ ہے کہ ری پبلکن سیاست داں بھی اس سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے کہ اتنے میں الیکشن آپہنچا۔ سب نے سوچا کہ اسے نائب صدارت کے لئے کھڑا کر دو اگر ہار گیا تو بھی گورنر نہیں رہیگا اور اگر جیت گیا تو بھی ہمارے سروں سے بلا ٹل جائے گی۔

قسمت جب جاگتی ہے تو حالات خود بخود ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ صدر میک کنلی اپنی دوسری صدارت کے چھ مہینے بھی نہ گذارنے پایا تھا کہ اسے کسی نے گولی مار دی۔ اب روزولٹ کو صدارت سنبھالنے کا موقع ملا۔ صدر بنتے ہی اس نے تجارت کو باقاعدہ بنانے کی طرف توجہ دی اور مضبوط خارجی پالیسی مرتب کی۔ مغرب کی زمینیں دن بدن برباد ہوتی چلی جارہی تھیں ان کی بحالی کے لئے پروگرام بنایا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ اس کی اصلاحات سے پوری قوم کو فائدہ ہو اور ہر فرد اس میں برابر حصہ لے سکے۔

روزولٹ بڑی بڑی کمپنیوں اور تجارتی اداروں کا مخالف نہ تھا

بلکہ اس کا خیال یہ تھا کہ امریکہ کی دولت مندی اور سرمایہ داری کی یہ ضروری اور قدرتی کڑیاں ہیں البتہ ان میں جو لوگ قانون سے کھیلتے تھے ان کا وہ سخت ترین دشمن تھا اور اس کا نشانہ وہ لوگ بنتے تھے جو اپنی دولت سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے حکام کو رشوتیں دیتے تھے۔ اور عوام کو لوٹتے تھے یا ان کے مفاد کے خلاف چلتے تھے۔

۱۸۹۵ء میں کانگریس نے تجارتی الحاق کے خلاف ایک قانون پاس کر دیا اور دو چار کمپنیوں کا مل کر ایک تجارت کو چلانا ممنوع قرار دے دیا۔ اور ساتھ ہی مزدوروں سے ہڑتال وغیرہ کا حق چھین لیا۔ روزولٹ کو بھلا یہ کب گوارا ہوسکتا تھا۔ وہ تو امیر غریب سب کا بھلا چاہتا تھا اسی لئے اس نے اس قانون سے اتفاق نہیں کیا لیکن چونکہ کانگریس پاس کر چکی تھی اس لئے چپ ہوگیا۔ مگر اس قانون کے باوجود اس کے مزاج میں فرق نہ آیا اور جب دو ریل کمپنیوں نے آپس میں الحاق کا معاہدہ کیا تاکہ مغربی لائن ایک انتظام میں چلے اور ایک ہی علاقے میں دو کمپنیاں ہونے کی وجہ سے گڑبڑ پیدا نہ ہو تو روزولٹ نے اسی قانون کے ماتحت عدالت سے ان کا معاہدہ منسوخ کرادیا لیکن ۱۹۰۲ء میں کانوں کے مالکوں اور مزدوروں میں کچھ جھگڑا ہوا اور بڑھتی ہوئی سردی کے موسم میں کوئلے کی سپلائی میں کمی آگئی اور عوام کو تکلیف پہنچی تو روزولٹ نے عوام کی تکلیف اور مزدوروں کے جائز مطالبات کے پیش نظر کان کے مالکوں کو حکم دیا کہ مزدوروں سے فوراً تصفیہ کیا جائے ورنہ کانوں کا انتظام میری فوج سنبھال لے گی۔ آخر مالک

مزدوروں کے آگے جُھک گئے اور ان کے مطالبات تسلیم کرلئے۔ یہ تھا روزولٹ کی فطرت کا اصلی عکس۔ اس کے لئے امیر غریب سب برابر تھے وہ کسی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مغربی علاقوں میں لوگ سرکاری زمین خرید کر ڈال لیتے تھے کہ کوئی موقع آئے گا تو فائدہ اُٹھائیں گے۔ اس طرح مغرب کے جنگلات اور چراگاہیں برباد ہوتی چلی جارہی تھیں اور علاقہ کا علاقہ بنجر ہوتا جارہا تھا۔ روزولٹ نے زمینوں کی فروخت بند کردی اور بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کے لئے بڑے بڑے بند تعمیر کرائے۔

ملک کے اندرونی نظام پر روزولٹ جس قدر توجہ دیتا تھا اسی قدر خارجہ پالیسی کی مضبوطی کا بھی خیال رکھتا تھا لیکن اس کے کچھ مخالفین اس کی خارجہ پالیسی کو غیر دانشمندانہ بتاتے تھے۔ روزولٹ کا قول تھا کہ شیریں کلامی سے پیش آؤ لیکن ہاتھ میں لکڑی رکھو۔ اس کے قول کو لوگ اس کی دورخی پر محمول کرتے تھے۔ حالانکہ اسی پالیسی نے اسے دنیا میں ممتاز و منفرد بنادیا اور دنیا میں اس کا دبدبہ اور اثر قائم کیا۔

فرانس نہر پانامہ بنانے میں ناکام ہوچکا تھا اور یورپ اور امریکہ کے جن جہازوں کو مشرقی ممالک جانا ہوتا تھا وہ جنوبی امریکہ کا پورا چکر کاٹ کر جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کانگریس نے نہر بنانے کی تجویز کی۔ چونکہ وہ علاقہ کولمبیا گورنمنٹ کی ملکیت تھا اس لئے روزولٹ نے ایک کروڑ ڈالر نقد اور سالانہ کرائے کی پیشکش کی جو کولمبیا نے کم سمجھ کر ٹھکرادی۔ اتفاق کی بات مین اس وقت وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔

اور حکومت بدل گئی امریکہ نے پھر اپنی پیشکش نئی حکومت کے سامنے دہرائی۔ نئی حکومت نے منظور کرلیا۔

جنوبی امریکہ میں کئی ملک ایسے تھے جو یوروپ کے مقروض تھے اور ان کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ قرضہ ادا کرسکیں۔ لہذا یورپین قوموں نے اپنے قرضے وصول کرنے کے لئے فوجیں بھیج دیں۔ روز ولٹ نے ان ملکوں کو امداد و اعانت کی پیشکش کی اور یقین دلایا کہ اگر وہ اندرونی انتظام امریکہ کو سونپ دیں تو امریکہ ان کی مالی حالت کو بہتر بنا دے گا اور تمام قرضے چکا دے گا۔ یہ پیشکش منرو کے اصول کے مطابق تھی اور اس کا مقصد صرف اپنے پڑوس کو مضبوط بنانا تھا تاکہ اپنی استقامت مضبوط رہے۔

۱۹۰۴ء میں نیا الیکشن آیا۔ لیکن روز ولٹ اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ ڈیموکریٹک حریف آلٹن پارکر اس کے سامنے ٹک ہی نہ سکتا تھا لہذا روز ولٹ پھر صدر منتخب ہوا۔ اس مرتبہ اس کی خارجہ پالیسی اور بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ روس اور جاپان کی جنگ ختم کراکر ان میں صلح کرادی۔ فرانس اور جرمنی کو مراقش کے مسئلے پر ٹکرانے سے بچالیا۔ اندرونی طور پر بھی اس نے کافی اصلاحات کیں اور خاص طور پر ریلوے کی اصلاح کے لئے کئی قانون بنوائے۔ عوامی زندگی کے جس شعبے میں جس خرابی کی طرف اسے توجہ دلائی جاتی وہ اس پر فوری کارروائی کرتا۔ وہ ان دو صدارتوں میں اس قدر نیک نام رہا کہ کسی کو انگلی اُٹھانے کی جرأت نہ ہوئی اور اگر وہ چاہتا تو ۱۹۰۸ء کے الیکشن میں پھر صدر منتخب ہو سکتا تھا لیکن اب اُس نے

الیکشن میں کھڑے نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لئے اس کے نائب ولیم ہاورڈ ٹافٹ کو الیکشن میں کامیابی ہوئی اور دسیوں مرتبہ کا ہارا ہوا ولیم جیننگ بریان پھر ہار گیا۔

روز ولٹ کی شاندار صدارت کے بعد جو صدر بھی آتا چاہے وہ کتنا ہی قابل اور محنتی ہوتا اس کے مقابلے میں اس کا ناکام نظر آنا قدرتی سی بات تھی یہی بیچارے ٹافٹ کے ساتھ ہوا حالانکہ اس کی سیاسی زندگی ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور مانا ہوا قانونی ماہر ہونے کے علاوہ وہ بہت تیز فہم اور سنجیدہ آدمی تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ عوام کو پھر بھی پسند نہ آیا۔ ٹافٹ نے روز ولٹ کی پالیسی ہی کو اپنایا اور اسی کے قدم بقدم چلنا شروع کر دیا۔

ری پبلکن پارٹی کے دو گروپ بن گئے۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ روز ولٹ کی داخلہ پالیسی بہت کامیاب تھی اس لئے اسی کو عمل میں لایا جائے یعنی درآمد برآمد کے ٹیکس کی شرح کم کر دی جائے۔ مزدوروں کی بہتری اور بھلائی کے لئے قانون بنائے جائیں اور امیروں پر انکم ٹیکس لگایا جائے۔ لیکن دوسرا طبقہ روز ولٹ کی پالیسی کو قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تجارت اور اس کے متعلقات میں کسی قسم کا دخل نہ دیا جائے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا ری پبلکنوں کا اول الذکر گروپ ٹافٹ کا زیادہ سے زیادہ مخالف ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جب اُس نے روز ولٹ کے چند منظور نظر ملازمین کو تبدیل کیا تو اس کے نظامِ حکومت کے خلاف بغاوت کھڑی کر دی اور ایک نئی جماعت "نیشنل ری پبلکن پروگریسو لیگ" بنا ڈالی۔ اس جماعت

نے بڑی اصلاحات کرائیں۔ ریلوں اور تجارتوں کو عوام کے مفاد کے مطابق بنایا مزدوروں کے حقوق منوائے۔ عوام کو یہ حق دلوایا کہ اگر وہ کوئی قانون اپنی بہتری اور بھلائی کے لئے منوانا چاہیں تو وہ حکومت کو لکھ کر دیسکتے ہیں اور مجبور بھی کر سکتے ہیں۔ جن سرکاری افسروں کی بدکاری روکے نہ رکتی تھی ان کا یہ علاج تجویز کیا کہ اگر عوام کی کافی تعداد کسی ملازم کے خلاف مل کر شکایت کرے تو اس کو ملازمت سے علیحدہ کردیا جائے۔ یہ پروگریسیو جماعت ابھی کچھ زیادہ نہ پھیلی تھی کہ روز ولٹ افریقہ کا شکار کی خاطر دورہ کر کے واپس آگیا۔ اس کے دوستوں نے پوچھا کہ اس کی سیاسی ہمدردیاں ٹافٹ کے ساتھ ہیں یا پروگریسیو جماعت کے ساتھ۔ روز ولٹ نے جماعت کو زیادہ پسند کیا حالانکہ عام خیال یہ تھا کہ وہ ٹافٹ کا ساتھ دے گا۔ پروگریسیو خیالات کے لوگ روز ولٹ کی اس رائے سے بہت خوش ہوئے اور اسے تیسری مرتبہ صدارت کے لئے نامزد کرنا چاہا۔ ٹافٹ اور روز ولٹ کسی زمانے میں بہت گہرے دوست تھے لیکن چونکہ ٹافٹ بھی نامزدگی کے لئے کوشاں تھا اس لئے اب ایک دوسرے کے حریف ہوگئے۔ ٹافٹ نے کچھ ایسے سیاسی ہیر پھیر ڈالے کہ نامزدگی میں اسی کو کامیابی ہوئی۔ اس پر روز ولٹ نے ناراض ہو کر ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دو ماہ بعد روز ولٹ کے حامی اور مددگار اکٹھے ہوئے اور پروگریسیو پارٹی قائم کر کے اپنا نمایندہ روز ولٹ کو نامزد کیا۔

ری پبلکنوں میں پھوٹ پڑ جانے سے ڈیموکریٹ یہ سمجھے کہ اب موقع ہے کہ پھر اقتدار جیت لیا جائے لہذا بالٹموس میں سب اکٹھے ہوئے اور چار دن

طرف نظر دوڑائی کہ کس کو نامزد کریں۔ بریان اگرچہ بڑا اچھا مقرر تھا لیکن وہ کئی مرتبہ الیکشن ہار چکا تھا اس لئے اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ آخر بہت تلاش اور جستجو کے بعد انھوں نے نیوجرسی کے گورنر ووڈرو ولسن کو نامزد کرنے کے لئے منتخب کیا۔ ولسن گریجویٹ ہونے کے علاوہ گورنری سے پہلے ایک کالج کا پروفیسر اور صدر رہ چکا تھا۔ اس کے سیاسی اعتقادات پروگریسیو گروپ سے ملتے جلتے تھے۔ مختصر یہ کہ ولسن کو کامیابی ہوئی۔ روزولٹ دوسرے نمبر پر آیا اور ٹافٹ تیسرے پر۔ سوشلسٹ نمایندہ سب سے پھسڈی رہا۔

عوام کو ڈر تھا کہ یہ کالج کا پروفیسر صدارت میں ناکام رہے گا لیکن ان کا یہ ڈر بہت جلد دور ہوگیا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ولسن عوامی آدمی نہیں تھا لیکن وہ اپنی دھن کا بڑا پکا تھا اور اس نے جو وعدے اپنی تقریروں میں انتخاب سے پہلے کئے ان میں سے ایک ایک کو اس نے پورا کیا۔ کرسی صدارت سنبھالتے ہی اس نے کانگریس کا اجلاس طلب کیا اور قانون سازوں سے کھلے الفاظ میں کہا "درآمد اور برآمد کے ٹیکس کا قانون بہرحال بدلنا ہی چاہئے ہمیں ہر وہ چیز ختم کردینی ہوگی جس سے کسی کو مستقل حق یا اجارہ داری قائم ہوتی ہو" کانگریس نے اس کی بات مان لی اور اس قانون میں ترمیم کردی پچھلے پچاس سال میں اس ٹیکس میں یہ پہلی ترمیم تھی جس سے کمی کا اعلان کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر ترمیم ٹیکس میں اضافہ ہی کرتی تھی۔ اس کمی سے غیر ملکی تاجروں کو بھی موقع ملا کہ مقابلہ کے لئے امریکہ کی منڈیوں میں اپنا مال بھیجیں۔ اس کمی سے سرکاری محاصل میں جو فرق پڑا وہ انکم ٹیکس بڑھا کر پورا کرلیا گیا۔ یہ انکم ٹیکس

دستور کی سولھویں ترمیم کے مطابق لگایا گیا تھا جس کو ٹافٹ کے آخری عہد میں ریاستوں نے بھی منظور کرلیا تھا۔

اس کے بعد ریاستہائے متحدہ کی سینٹ کے ممبران کے انتخاب کا جو قاعدہ دستور میں متعین کیا گیا تھا سترھویں ترمیم کے ذریعہ اسے بھی بدل ڈالا کیونکہ ملک کا سیاسی ذہن و فکر بدلتا جارہا تھا اور لابی حلقے سیاستدانوں کے دماغ پر چھاتے چلے جارہے تھے وہ ریاستی اسمبلیوں پر اس طرح اثر انداز ہورہے تھے کہ سینٹ کے لئے وہ جس کو چاہتے تھے منتخب کراسکتے تھے۔ ولسن کا اگلا قدم امریکہ کے بگڑے ہوئے بنکنگ سسٹم کی درستی کے لئے بڑھا۔ بنکنگ چند خاص لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ صدر نے کہا "بنک خواص کے نہیں عوام کے قبضے میں ہونے چاہئیں یعنی گورنمنٹ کے کنٹرول میں ہونے چاہئیں تاکہ یہ عوام پر حکومت نہ کریں بلکہ عوام کی خدمت کریں۔ اور کسی ایک آدمی کی جاگیر بن کر نہ رہ جائیں۔ اس کے نتیجے میں فیڈرل ریزرو ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے ملک کو بارہ اضلاع میں تقسیم کرکے ہر ضلع کا ایک بڑا بنک بنایا گیا جس کو سکہ سازی کے اختیارات دیدیئے گئے اور اس نظام کو باقاعدگی سے چلانے کے لئے ایک فیڈرل ریزرو بورڈ قائم کردیا گیا۔ یہ آج بھی قائم ہے اور مالیات کے سلسلے میں ملکی مشینری کا ایک مستقل جزء ہے۔

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد صدر ولسن نے چھوٹے چھوٹے دکاندار تاجروں اور چھوٹے چھوٹے پیشے کے لوگوں کی طرف توجہ دی۔ ان کے لئے بھی ایک قانون بنایا گیا جس سے ان کے حقوق کی حفاظت کی گئی اور ان کی

طمانیت کی ضمانت دی گئی ۔ اس کے ساتھ ہی کارخانہ داروں اور بڑے تاجروں کے اختیارات محدود کردیئے گئے ۔ مزدوروں وغیرہ کے ساتھ جانبدارانہ کارروائی کو ختم کرنے کے لئے یہ حکم دے دیا گیا کہ ایک دوسرے کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شریک ہوں ۔ اس سے خود تاجروں اور کارخانہ داروں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور ایک دوسرے کے مقدمات کو حل کرنے میں بھی مدد ملی ۔ فیڈرل ٹریڈ کمیشن قائم کیا گیا تاکہ تجارت اور صنعت کی غلط راہوں پر نگاہ رکھے اور صحیح راستہ دکھاتا رہے ۔

اسی طرح زمینوں کے "زمین بنک" قائم کردیئے گئے جہاں سے کاشتکار سرکاری زمین بہت ہی کم نرخ پر کاشت کے لئے لے سکتے تھے ۔

صدر ولسن نے ایک دفعہ کہا تھا "اگر مجھے داخلی سے زیادہ خارجی معاملات پر توجہ دینی پڑی تو یہ قدرت کا میرے ساتھ بہت بڑا مذاق ہوگا"۔ اس کی وجہ تو یہ تھی کہ وہ ملک کی اندرونی حالت میں بہت کچھ انقلاب لانا چاہتا تھا اور دوسری یہ کہ اسے بین اقوامی معاملات کا کوئی علم و تجربہ نہ تھا ۔ یہ اس کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی صدارت کا بیشتر حصہ ایسے حالات میں گذرا جبکہ دنیا ایک بحرانی دور سے گذر رہی تھی ۔ پہلی چیز جس نے صدر ولسن کو چونکا دیا میکسیکو کی بغاوت تھی باغی ہیورتا نے حکومت پر قبضہ کرلیا ۔ یورپ نے فوراً ہیورتا کو حکمراں تسلیم کرلیا کیونکہ میکسیکو کی بہت سی تجارتوں میں ان کا سرمایہ لگا ہوا تھا ۔ امریکہ سے بھی درخواست کی گئی کہ میکسیکو کی بقا، کے پیش نظر ہیورتا کی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے ۔ لیکن صدر ولسن کو ہیورتا کا اس طرح حاکم بن بیٹھنا پسند نہ آیا

اس لئے اس نے مطالبہ کیا کہ ہیورتا پہلے استعفیٰ دے۔ اس کے بعد واقعات کا چکر کچھ اس طرح چلا کہ امریکی فوج نے بندرگاہ ویراکروز پر قبضہ کرلیا۔ اب ہیورتا نے مجبوراً جنرل کرانسرا کے حق میں استعفا دے دیا۔ نئی حکومت نے میکسیکو کو امریکہ کے سامان اور ہتھیاروں کے بل پر متحد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کرانسرا کے مخالف پنچولا کی رہنمائی میں بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہوگئے اور امریکہ کی فوج کو دھکیلتے ہوئے امریکی سرحدوں کے اندر گھس آئے۔ اور بہت سے شہریوں اور فوجیوں کو قتل کر دیا۔ امریکہ کے فوجی پھر سنبھل کر بڑھے پنچولا تاب نہ لاکر بھاگ کھڑا ہوا اور باوجود تعاقب اور تلاش کے ہاتھ نہ آیا

میکسیکو کی یہ بغاوت چاہے کتنی بڑی ہو لیکن امریکہ کے لئے اس کی حیثیت چاء کی پیالی کے طوفان سے زیادہ نہ تھی۔ اس سے کہیں بڑی مشکلات تو یورپ کے معاملات پر آئی تھیں۔ اگست ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے فرانس انگلینڈ اور روس پر الزام لگایا کہ وہ براعظم یورپ میں اس کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور باقی دنیا میں بھی انھوں نے اس کی نقل و حرکت پر پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ آسٹریا اور ہنگری نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا، یہاں سے ہوئی کہ آسٹریا کے ولیعہد کو ایک سربی[1] نے قتل کر دیا۔ آسٹریا نے سربیا کی سرکوبی کرنا چاہی لیکن روس سربیا کی مدد پر آگیا یہ دیکھ کر جرمنی آسٹریا کی طرف ہوگیا۔ پھر کیا تھا اچھی خاصی دھڑے بندی ہوگئی۔ اٹلی انگلینڈ کے ساتھ اور فرانس روس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ ترکی اور بلغاریہ مرکزی طاقت کے ساتھ مل گئے لیکن امریکہ نے منرو کے اصول پر عمل کرتے

---

[1] سربیا کا رہنے والا۔ مترجم

ہوئے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔

جرمنی نے اُٹھتے ہی بلجیم کا صفایا کیا اور اس کو روندتا ہوا پیرس تک جا گھسا یہاں بڑی جم کر لڑائی ہوئی۔ امریکی اس جنگ کی خبریں اخباروں میں پڑھتے اور اتحادیوں کے بہادرانہ مقابلوں کی داد دیتے۔ انھیں جرمنی کے مقابلے میں برطانیہ اور فرانس سے ہمدردی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمدردی ان کے ساتھ پرانے تعلقات کی بنا پر ہو یہ اور بات ہے کہ وہ تعلقات زیادہ خوشگوار نہیں رہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ نپولین کی جنگوں کے دوران میں ایک دوسرے کی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کی گئی تھی ایسا ہی اس جنگ میں ہوا اور امریکی جہاز جو سامانِ جنگ اور غلہ لے کر ان علاقوں سے گذرے وہ پکڑے گئے لیکن جہاں سمندر پر برطانوی قبضہ تھا اس علاقے کے پکڑے ہوئے جہاز تو برطانیہ نے صرف اپنی نگرانی میں لے لئے انھیں تباہ نہیں کیا۔ برخلاف اس کے جرمن یہ کرتے تھے کہ جہاں کوئی جہاز ان کے علاقے میں آیا ان کی ڈبکنی کشتی نے نیچے ہی سے تارپیڈو مارا اور ڈبو دیا۔

امریکی اپنے جہازوں کا نقصان تو شاید برداشت کر لیتے مگر جہاز کے مسافروں کی جانیں ضائع ہونا انھیں سخت ناگوار گذرا کیونکہ اس زد میں مسافر بردار جہاز بھی آ جاتے تھے۔ مثلاً انگلینڈ کا جہاز "لوسی ٹینیا" جب ڈوبا تو اس میں ایک ہزار دو سو پچاس مرد عورتیں اور بچے سوار تھے جن میں ایک سو چودہ امریکی تھے۔ جرمنی نے جانوں کے ضائع ہو جانے پر تو اظہار افسوس کیا مگر اپنے مذموم فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہدیا کہ اس جہاز میں جنگی

ہتھیار جا رہے تھے اس وجہ سے ہم نے اسے ڈبو دیا۔

صدر ولسن بار بار احتجاج کرتا تھا کہ جرمنی کی ڈبکنی کشتیاں امریکہ کو نقصان پہنچا رہی ہیں مگر جرمنی ہر دفعہ رسمی اظہار معذرت کر کے ٹال جاتا۔ دراصل جرمن امریکہ سے اس پر ناراض تھا کہ امریکہ اتحادیوں کو بڑے بھاری بھاری قرضے دے کر ان کی زندگی میں اضافہ کا باعث ہو رہا ہے اور ان کو غلّہ اور ہتھیار سپلائی کر کے مرکزی طاقتوں (جرمنی وغیرہ) کی راہ میں مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ امریکہ اپنی پالیسی کے مطابق جرمنی کی بھی مدد کرتا تھا مگر وہ مدد بس برائے نام تھی۔

جوں جوں جرمنی کے سمندر پر حملے سخت ہوتے جا رہے تھے امریکہ کے عوام کی رائے اسی تیزی سے اس کے خلاف ہوتی جا رہی تھی۔ ولسن کی غیر جانبدارانہ پالیسی سے عوام بہت مطمئن تھے اور ۱۹۱۶ء میں جب صدارتی الیکشن آیا تو اسی بات پر وہ پھر الیکشن جیت گیا۔ لیکن امریکہ زیادہ دیر تک غیر جانبدار نہیں رہ سکا۔ امریکہ کو ثبوت کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ جرمنی نے میکسیکو اور جاپان کو اُبھار رکھا ہے کہ جیسے ہی امریکہ جنگ میں کودے وہ اس پر حملہ کر دیں۔ جب جرمنی نے انگلستان کو جھکانے کے لئے اعلان کر دیا کہ اب اس کی ڈبکنی کشتیاں ہر سمندر میں حدود کی پابندی کے بغیر جائیں گی تو صدر ولسن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور آخر صدر کے اشارے پر ۶/ اپریل ۱۹۱۷ء کو کانگریس نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس اعلان جنگ کی اور بھی کئی وجہیں تھیں جن میں سے اہم یہ تھی کہ صدر ولسن یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جمہوریت کو زندہ

رکھنے کے لئے اس جنگ میں اتحادیوں کو جیتنا چاہئے۔ کیونکہ مرکزی طاقتیں (جرمنی، بلغاریہ، ترکی وغیرہ) سب کی سب بادشاہتیں تھیں اور اگر ان کو کامیابی ہوتی تو یقیناً دنیا میں جمہوریت کے بجائے بادشاہت کا بول بالا ہوتا۔ جب کہ صدر ولسن یہ طے کر چکا تھا کہ دنیا میں جمہوریت کی بقا اور استحکام کے لئے کوشش کی جائے اور دنیا کی جمہوریتوں کو لیگ آف نیشنز کے نام سے متحد کر کے ان میں فاتح اور مفتوح کا فرق مٹا کر بھائی چارہ قائم کرایا جائے اور اس طرح جب مل کر بیٹھیں گے تو ان کے سارے تفرقے مٹ جائیں گے۔ یہی خیال ولسن کے چودہ نکاتی صلح نامے کی بنیاد تھا جو اس نے ۱۹۱۹ء میں پیش کیا۔

ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے امریکہ پہلی جنگ عظیم میں کود پڑا۔ تاجروں اور کارخانہ داروں نے تمام قسم کے کنٹرول منظور کر کے اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور مزدوروں نے اپنے ہڑتال کے حق سے دستبردار ہو کر۔ غرض پوری قوم نے صدر کی آواز پر لبیک کہا اور پورا پورا تعاون پیش کیا۔ اگر امریکہ سے اربوں بلکہ کھربوں ڈالر کی امداد، سیکڑوں جہاز بھر غلہ اور ہتھیار مانگے جاتے تو امریکہ کے لئے گویا کوئی بات ہی نہ ہوتی مگر اتنی بڑی جنگ کے لئے فوج بھرتی کرنا، اس کو ترتیب دینا اور پھر تین ہزار میل دور محاذ جنگ پر لے جانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ کیا گیا اور اس تیزی اور جوش کے ساتھ کیا گیا کہ صرف ایک سال بعد سات لاکھ مسلح امریکی جوان جنرل پرشنگ کی کمان میں اتحادیوں کی طرف سے لڑ رہے تھے اور اس کے صرف چھ ماہ بعد یہ تعداد بیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ امریکہ نے جب اس طرح بے اندازہ آدمی جنگ میں

جبو کے تو بڑی طاقتیں گھبرا اُٹھیں اور ۱۹۱۸ء کے موسم بہار میں جرمنی نے جنگ ختم کرنے کے لئے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر اس وقت فرانس کا مارشل فوش تھا اس نے امریکی مقابلے کے لئے بھیج دیئے۔ یہ امریکی اس بے جگری سے لڑے کہ جرمنوں کو ناک چنے چبوا دیئے اور جب ان کا حملہ ناکام بنا دیا تو مجتمع ہو کر ایک ایسا زور کا ہلّہ بولا کہ جرمنی کی دفاعی لائنوں تک گھستے چلے گئے اور بارہ لاکھ جوان میوز ارگان میں پھیل گئے جہاں قدم قدم پر مشین گنیں لگی ہوئی تھیں۔ جرمنی کی فوجیں ہٹتی گئیں اور پیچھے ہٹتی گئیں غرضیکہ پورے محاذ پر جرمنی کو شکست ہوتی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یہ جنگ جرمنی کی مکمل شکست پر ختم ہو گئی۔

اگرچہ امریکہ اس جنگ میں دیر سے شریک ہوا تھا اور اس اعتبار سے اس کے سپاہیوں کا اتلاف جان بھی کم ہوا مگر اس کے آدمیوں، اس کی رسد کی وجہ سے اس کا پلّہ جنگ کے تمام اتحادیوں سے بھاری رہا۔

اس جنگ کے اختتام نے دنیا کا ایک بہت بڑا تنازعہ ختم کر دیا اور جرمنی کو مجبور کر دیا کہ جن ملکوں پر اُس نے قبضہ کر لیا تھا اُنھیں آزاد کر دے۔ امن کے معاہدے میں صدر ولسن نے اپنے چودہ نکات پیش کئے جن کا مقصد تھا کہ ملکوں کے خفیہ معاہدے ختم کر دیئے جائیں، فوجوں اور فوجی اخراجات کو گھٹایا جائے، سمندروں پر کسی کا قبضہ نہ ہو اور ہر ملک انھیں آزادی سے استعمال کرے اور سب سے زیادہ ضروری یہ کہ لیگ آف نیشنز قائم کی جائے۔ یہ پروگرام لے کر صدر ولسن ۱۹۱۹ء کے شروع میں خود پیرس گیا تاکہ امن کی گفت

دشنید میں بذاتِ خود حصہ لے۔

پیرس میں انگلینڈ کے لائڈ جارج، فرانس کے سلیمن سیو اور اٹلی کے اورلینڈو سے ملاقات ہوئی۔ ان تینوں ملکوں کو دشمن نے سخت نقصان پہنچایا تھا اس لئے ان کے نمایندوں کے نظریات ولسن سے بہت مختلف تھے۔ ان سب کا کہنا تھا کہ جرمنی کو تاوانِ جنگ ادا کرنا چاہیئے اور اس کی ادائیگی کی بہتر صورت یہ ہے کہ لوہے کے ذخیرے اور کوئلے کی کانیں حوالے کردے اور اپنی نوآبادیوں سے دستبردار ہو جائے۔ ولسن نے صرف لیگ آف نیشنز کی بنیاد رکھنے کی خاطر ان کی بہت سی تجویزوں کو منظور کرلیا اور آخر ورسلز کے مقام پر عہد نامہ ہوگیا۔ لیگ آف نیشنز کی نوممبروں پر مشتمل ایک انتظامیہ کونسل بھی بنادی گئی۔ اس کونسل میں انگلستان، فرانس امریکہ، اٹلی اور جاپان کو مستقل نشستیں دی گئیں۔ بہت سے مسائل ایسے تھے جن پر فیصلہ دینے کے لئے نو کے نوممبروں کا متفق ہونا ضروری تھا۔ حملہ قانون سے بالکل خارج تھا۔ اس کونسل کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ اگر کوئی ملک کسی ممبر ملک پر حملہ کردے تو کونسل اس کو مناسب اقدامات پر مشورہ دے اور اگر اجتماعی بائیکاٹ کا حربہ ناکام ہوجائے تو یہ مشورے فوجی کارروائی کرنے کے لئے بھی ہو سکتے ہیں۔ کونسل کے علاوہ ایک مشاورتی اسمبلی، ایک بین اقوامی لیبر آفس اور ایک بین اقوامی عدالت کا قیام بھی اسی لیگ آف نیشنز کی ایک کڑی تھا۔

معاہدہ پر ۱۹ر جون ۱۹۱۹ء کو دستخط کرنے کے بعد صدر ولسن نے اسے سینٹ کی تصدیق کے لئے بھیجدیا مگر اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا گیا کیونکہ دستور

میں صدر کو معاہدہ کرنے کا اختیار اس شرط کے ساتھ دیا گیا تھا کہ سینٹ کے دو تہائی ممبر بھی اس سے متفق ہوں۔ لہٰذا سینٹ کے ممبران نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ بغیر ان سے مشورہ کئے صدر نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدے کی کئی دفعات پر اعتراض ہوئے اور لیگ آف نیشنز کے تو نظریہ کی بھی مخالفت کی گئی۔ طرح طرح کے شکوک اور شبہات کا اظہار کیا گیا اور آخر ری پبلکنوں کے لیڈر ہنری لاج نے اعلان کر دیا کہ ہم اس عہدنامے سے اُسی وقت متفق ہو سکتے ہیں جب اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ کی جائے لیکن ولسن جو کچھ کر چکا تھا اس میں ذرہ برابر تبدیلی پر رضامند نہ ہوا۔ وہ پیرس سے لوٹ آیا اور اعلان کر دیا کہ اگر معاہدے میں تبدیلی کی گئی تو معاہدہ کمزور ہو جائے گا۔ صدر سخت محنت سے تھک چکا تھا اس لئے ایک پبلک جلسے میں بولتے بولتے چکرا کر گر پڑا اور ایسا گرا کہ سیاسی زندگی میں پھر کبھی نہ اُٹھ سکا۔ سینٹ نے معاہدے کو قطعی طور پر مسترد کر دیا جب کہ دوسرے اتحادی ممالک نے اس کی توثیق و تصدیق کر دی آخر دو سال کی ردوکد کے بعد امریکہ نے جرمنی سے ایک علیحدہ معاہدہ کیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امریکی قوم بین الاقوامی امن کے قیام کی کوشش کرتے کرتے تھک گئی ہے غالباً یہی وجہ تھی کہ وڈرو ولسن کے آخری الفاظ پر قوم نے توجہ نہ دی۔ اس نے کہا تھا "ہمیں دنیا کا لیڈر بننے کا موقع ملا تھا مگر ہم نے اسے کھو دیا اور جلد ہی ہمیں اس کے خوفناک نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

نواں باب

اعتدال کی بحالی اور نئے حالات

دوران جنگ میں ملک کا سارا انتظام الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا اور ۱۹۱۸ء میں جب یہ طوفان ختم ہوا تو امریکہ کچھ عجیب سی اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے قومی قرضوں کی مقدار ایک ارب سے بڑھا کر سوا چھبیس ارب کر دی تھی اور امید یہ تھی کہ اس طرح اتحادیوں کو دیئے ہوئے قرض کا خلا پورا ہو جائے گا۔

بیرونی دنیا میں بھی حالات کچھ ایسے پُرسکون نہ تھے۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا اور انھوں نے ساری دنیا میں اپنی تحریک کا پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اس خوبصورتی اور ہوشیاری سے اپنے جاسوس تمام ملکوں میں پھیلائے تھے کہ ہر ملک میں ان کا ایک خفیہ اڈہ موجود تھا اور کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ کمیونسٹ کون ہے۔ ایک پارٹی

"انڈسٹریل ورکرز آف ورلڈ" (دنیا کے مزدوروں کی جماعت) کے نام سے
بنائی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کے مزدوروں کو اپنے چنگل میں پھنسا
لیا جائے۔ مزدوروں کی یہ گڑبڑ امریکہ میں شروع ہوئی تو بہت سوں کو اس
شورش کے سلسلے میں جیل میں ڈال دیا گیا اور کئی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ کیونکہ
ملک کو اس وقت سکون کی ضرورت تھی تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو اور امن
کا زمانہ پھر پلٹ آئے۔ جنگ کے زمانے میں سارے ملک کی توجہ جنگ
اور جنگی سامان پر لگی ہوئی تھی اس لئے زندگی کی عام ضروری اشیاء پہلے ہی کمیاب
تھیں کہ مزدوروں کی شورش نے اور بھی بُرا اثر ڈالا اور قیمتیں بے اندازہ چڑھ گئیں
عوام نے اس ہوش ربا مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لئے تنخواہوں اور اُجرتوں میں
اضافہ چاہا۔ مظاہرے ہوئے ہڑتالیں ہوئیں۔ کوئلہ کے کانوں میں تو اتنی زبردست
ہڑتال ہوئی کہ حکومت کو تصفیہ کرانا پڑا۔

۱۹۱۹ء میں حکومت نے دستور میں اٹھارہویں ترمیم لانی چاہی جس کی رو
سے شراب کشید کرنا اور بیچنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ ترمیم اگرچہ پاس
ہوگئی لیکن عملاً فیل ہی ہوئی۔ لوگ شراب کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ
یہ کاروبار خفیہ طریقے سے چلنے لگا۔ یہ ناجائز کاروبار شورہ پرست لوگوں کے
ہاتھ میں تھا اور یہ لوگ اپنے حریفوں کو مارنے اور قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے
تھے۔ سارا ملک اس اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ
دل شکستہ نہیں تھے۔ ان میں ترقی کرنے اور ملکی حالت کو سنوارنے کا جذبہ بدستور
موجود تھا اور وہ اس طرف لگے ہوئے بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء کے الیکشن میں مسئلہ

ہی یہ تھا کہ آیا ولسن کے لائے ہوئے حالات اور لیگ آف نیشنز کو مانا جائے یا ملک کے سابقہ اعتدال کو بحال کیا جائے یعنی وہی حالات پیدا کئے جائیں جو جنگ سے پہلے تھے مثلاً صنعت کی حفاظت کے لئے درآمد برآمد پر بھاری ٹیکس، دنیا کے معاملات میں خاموشی اور علیحدگی پسندی۔ اس الیکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں عورتوں کو بھی رائے دینے کا حق دیا گیا تھا جس کے لئے مدت سے احتجاج اور مطالبے ہو رہے تھے۔ الیکشن کے نتائج ظاہر کرتے تھے کہ لوگوں کو ڈیموکریٹوں کے نظریات سے بالکل دلچسپی نہیں اور وہ اب پھر ری پبلکن پارٹی کے حق میں ہیں۔ چنانچہ ری پبلکن نمائندہ جی وارن ہارڈنگ کامیاب ہوا جو ایک بہت ہی صلح جو اور مقتدر اخبار کا ایڈیٹر تھا۔

ری پبلکنوں نے حکومت کی کرسی سنبھالتے ہی درآمد برآمد پر ٹیکس کی شرح میں اضافہ کر دیا اور سارے ملک کی اقتصادی حدبندی کر دی۔ اس کا اثر ملک کی اندرونی حالت پر بہت اچھا پڑا۔ کارخانے مشینوں کے شور سے گونج اٹھے اور صنعت کو عروج ہوا لیکن اس سے کچھ نتائج ملکی مفاد کے خلاف بھی نکلے۔ مثلاً یہ کہ ٹیکس کی شرح بڑھ جانے سے یوروپ کے ممالک کا مال امریکہ کی منڈیوں میں آنا بند ہو گیا اور وہ ڈالر کمانے سے محروم ہو گئے اور جب ان کے پاس ڈالر نہ ہوں تو وہ امریکہ کا جنگ میں دیا ہوا قرض کیسے واپس کر سکتے تھے اس لئے ملک کے معاشی ماہرین نے بار بار حکومت کو مشورہ دیا کہ اگر اپنا قرض وصول کرنا ہے تو ٹیکس کی شرح گھٹائی جائے۔

دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ میں بسنے کے لئے لوگوں کا

سیلاب کم ہوگیا اور ملازمتیں امریکیوں کو بہت آسانی سے ملنے لگیں۔ دوسرے یہ کہ لوگوں میں غیر ملکی مال کے خلاف جذبہ بڑھ گیا۔

یہ تمام پالیسیاں اپنی جگہ پر تھیں لیکن امریکہ دنیا کی عظیم طاقتوں کے ساتھ مل کر اس کی برابر کوشش کر رہا تھا کہ فوجی ذہنیت کم کی جائے اور امن کو زیادہ سے زیادہ دیرپا بنایا جائے۔ اس سلسلے میں صدر ہارڈنگ کے سکریٹری برائے امور مملکت نے ۲۲-۱۹۲۱ء میں ایک بین اقوامی کانفرنس بلائی جس میں ممبروں کی تعداد کے متعلق فیصلہ کیا گیا اور تمام عظیم طاقتوں سے چین اور مشرق بعید کے متعلق ان کی پالیسی کی تشریح کرائی گئی تاکہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہ جائے اور اس کے متعلق ایک عہد نامہ تیار کر لیا گیا۔ دبکنی کشتیوں کے متعلق بھی ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے جنگی زمانے میں تجارتی جہازوں پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ کانفرنس ہارڈنگ کے دور کی بہترین کامیابی ہے جس کو کچھ عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں نے نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔ صدر کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اُڑائی گئیں اور اس کو ہر بے ایمانی اور خیانت کا حصہ دار بنانے تک سے گریز نہ کیا گیا۔ قدرت کو ہارڈنگ کو مزید بدنامیوں اور الزاموں سے بچانا مقصود تھا کہ الاسکا سے واپس ہوتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں اسے اس جہان سے اُٹھا کر دُنیا کی اُلجھنوں سے نجات دیدی۔

ہارڈنگ کی جگہ نائب صدر کیلون کولیج کو دی گئی۔ کولیج کی ایمانداری اور دیانتداری عام طور پر مشہور تھی لیکن خیالات کے اعتبار سے وہ قدامت پسند تھا۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد ملک اس قدر خوشحال ہوتا چلا گیا کہ حکومت اگر انکم ٹکیس کم بھی کر دیتی تو بھی سرکاری محاصل میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ سرکاری خزانہ بھرپور تھا اور قومی قرضے بھی بجائے پچیس کے کل سولہ ارب رہ گئے تھے۔ پیداوار کے لحاظ سے اگر اس زمانے کو زرّیں دَور کہدیا جائے تو بیجا نہیں ہے کیونکہ موٹر گاڑیاں، ریڈیو، ریفری جیریٹر، کپڑے دھونے کی مشینیں اور دوسری قسم کی مشینیں بڑی تعداد میں بننے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشین کی ایک ایک حرکت اور کارخانوں کا ایک ایک لمحہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہے۔ ان تیار ہونے والی چیزوں کی کھپت زیادہ تر تو ملک کے مزدور طبقے میں ہی تھی اور باقی عوام خرید لیتے تھے۔ غرضیکہ یہ چکر اس طرح چلتا رہا اور اُمید یہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں غربت بالکل دُور ہو جائے گی اور عوام اس قدر مالدار ہوں گے کہ ہر ایک کے گیرج میں دو موٹر کاریں نظر آئیں گی۔

کارخانوں کے مالکوں نے مال کی مزید نکاس کے لئے اشتہار کا طریقہ اختیار کیا۔ صابن اور سگرٹیوں وغیرہ کی خوبیاں ریڈیو سے نشر کی جانے لگیں تاکہ عوام کی خرید میں اضافہ ہو۔ اس کے علاوہ بھی عوام کو متوجہ کرنے کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کئے گئے۔ فروخت میں اضافہ کرنے کے لئے بڑی بڑی قیمتوں کی چیزیں اقساط پر بکنی شروع ہو گئیں لیکن پیدوار اس قدر زیادہ تھی کہ ان تمام ذرائع کو اختیار کرنے کے باوجود بھی امریکہ کی گھریلو مانگ پیداوار کے مقابلے میں پیچھے رہ گئی اور پھر مال کے انبار لگنے شروع ہو گئے اب ضرورت ہوئی کہ اس مال کو غیر ملکی منڈیوں میں بھیجا جائے تاکہ کارخانے کے مالکوں کا سرمایہ بندھ کر

نہ پڑجائے لیکن سوال یہ تھا کہ دوسرے ملک ادائیگی کیسے کریں گے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ درآمد برآمد کا ٹیکس کم کر دیا جائے۔ تاکہ غیر ملک اپنا مال امریکہ میں لاکر بیچیں اور امریکہ کا خرید کرے جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ دوسرے ممالک کو جو تقریباً دیوالیہ ہوئے بیٹھے ہیں مزید قرض دیا جائے تاکہ وہ امریکہ کی مصنوعات خریدیں۔ دوسرا طریقہ زیادہ کارآمد تھا اس سے اپنا دیا ہوا قرض مال کی قیمت کی صورت میں واپس امریکہ میں آجاتا تھا اور لینے والا ملک پھر مقروض کا مقروض رہ جاتا تھا۔ لہٰذا حکومت نے یہی طریقہ اپنایا۔

ملک کی ترقی اور خوشحالی کے پیش نظر عوام نے پھر ری پبلکن حکومت کو پسند کیا اور ۱۹۲۴ء کے الیکشن میں کیلون کولیج کو صدارت کے لئے چنا لیکن باوجود ہزار خوش حالیوں کے کسانوں کی حالت عام طور پر اچھی نہ تھی۔ جنگ کے زمانے میں تو وہ جو کچھ پیدا کر سکتے تھے کیا لیکن اس مشینی دور میں انھوں نے مشینوں سے فائدہ اُٹھاکر جو کچھ پیدا کیا دنیا کی منڈیوں میں اس کی بہت ہی کم قیمت پڑ رہی تھی۔ ادھر حکومت فاضل ذخیروں کو خریدنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ صدر کولیج نے مزید غلّہ خریدنے سے تو انکار کر دیا مگر کسانوں کی مدد کر کے انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا وعدہ کر لیا۔

کولیج کی صدارت کے آخری سال میں کرنل چارلس لنبرگ نے نیویارک سے پیرس تک مسلسل پرواز کا ریکارڈ قائم کیا۔ ہوائی جہاز کی صنعت کی یہ ایک بہترین مثال تھی۔ اسی سال کا دوسرا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ امریکہ اور فرانس کی مشترکہ اپیل پر دنیا کے تقریباً اٹھ ملکوں میں آپس میں جنگ نہ کرنے

کا معاہدہ ہوا اور جب اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا گیا تو دنیا مستقل امن کی مسرت سے ناچ اُٹھی۔

جب اخباری نمایندوں نے صدر کولیج سے پوچھا کہ کیا آپ ایک مرتبہ اور صدارت کے لئے منتخب ہونا چاہتے ہیں تو صدر نے جواب دیا کہ میرا ارادہ نہیں ہے۔ اس کے اس جواب سے مایوس ہو کر ری پبلکنوں نے سنہ ۱۹۲۸ء کے الیکشن کے لئے امریکہ کے سکریٹری برائے امور تجارت ہربرٹ ہور کو صدارت کے لئے نامزد کیا۔ ہور کان کا بہترین انجینئر تھا اور برسوں غیر ممالک میں پھر کر امریکہ کی تجارت کو فروغ دیتا رہا تھا اس لئے اسے تجارتی دنیا کا وسیع تجربہ تھا۔ الیکشن میں ووٹروں نے ہور کی بڑی حمایت کی اور حد تو یہ ہے کہ کئی جنوبی ریاستوں نے بھی اس ری پبلکن نمائندے کو ووٹ دیا۔ خانہ جنگی کے بعد تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جنوب میں ری پبلکن نظریات کی حمایت کی گئی تھی۔ الیکشن ختم ہوا اور ہور امریکہ کا صدر بن گیا۔ اس کی صدارتی تقریر کے ابتدائی الفاظ امریکہ کی تاریخ میں ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔ اس نے کہا "مجھے امریکہ کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ نہیں ہے۔ مستقبل بہت شاندار ہے اور بہت امید افزا۔"

ان الفاظ نے عوام پر جادو کی طرح اثر کیا اور سارے ملک میں اطمینان اور اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے حصّوں کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ عام طور پر ہر خط اور ہر ٹیلیفون کال میں یہی ہوتا تھا کہ فلاں چیز خرید لی جائے اور فلاں چیز کا یہ بھاؤ منظور ہے۔ دولت ساون کی جھڑی کی طرح برس رہی تھی۔ دلال اور آڑھتیوں کے گھر سے ہو رہے تھے۔ سودے پر سودا چکاتے

تھے اور خوب رقمیں چیرتے تھے۔ تجارت عروج پر تھی۔ ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں کے حصے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور حصے تھے کہ برابر چڑھتے چلے جارہے تھے۔ کسی بھاؤ رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ۱۹۱۹ء کے خزاں تک ان کی قیمتیں اپنی انتہائی عروج پر پہنچ گئیں۔ بنک والے اور پبلک دونوں حیران تھے کہ آخر ان کا ٹھہراؤ کہاں ہوگا۔ لیکن پبلک میں ایک شبہے کی لہر آئی اور اُس نے صرف دس دن میں یہ سارا عروج خاک میں ملا دیا۔ شک جس چیز میں بھی پیدا ہو جائے اس کی قدر گھٹتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہی حال اس بڑھتی ہوئی تجارت کا ہوا۔ پہلا گراؤ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں آیا اور لوگ اس قدر خوف کھا گئے کہ جس کو جو کچھ ملا اسی بھاؤ پر اپنا مال بیچ دیا۔ کمپنیوں کے حصوں کی قیمتیں بھی گرتے گرتے اپنی اصلی قیمت کا پانچواں حصہ رہ گئیں اور بہت سی تو بالکل ہی ختم ہو گئیں لیکن ملک نے اس کی پرواہ بھی نہ کی اور بڑے اطمینان سے اس کے اسباب و علل کی تحقیق شروع کر دی ان کی تحقیق کا بنیادی خیال یہ تھا کہ کہیں اس زوال سے صنعت کو تو نقصان نہیں پہنچا ہے۔ کیونکہ امریکیوں کے خیال میں خوشحالی اور ترقی کا راز در اصل صنعت ہی تھی باقی سب چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فیکٹریاں اور کارخانے اس کی زد سے بالکل محفوظ ہیں تو گھبرانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی اور یہ یقین کر لیا گیا کہ یہ زوال عارضی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تحقیق ہو گئی کہ اس یکلخت خرابی کی وجہ مال کا طریقۂ تقسیم ہے۔ اسی وجہ سے جہاں تاجر مال بیچنا چاہتے ہیں وہاں نہیں بکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک دفعہ حصوں کی قیمت گر جائے تو ذرا مشکل سے

سنجلتی ہے اور اس کا اثر لازمی طور پر عام تجارت پر پڑتا ہے۔ یہی امریکہ میں بھی ہوا۔ حصّوں کی قیمتیں گرتے ہی لوگوں نے مال کے آرڈر منسوخ کرنے شروع کر دیئے جس کو کار لینی تھی اُس نے کار نہیں لی اور جس کو نیا سوٹ بنوانا تھا اس نے سوٹ نہیں بنوایا اس حالت میں صنعت پر یہ اثر ضرور پڑا کہ چونکہ مال کی مانگ نہیں رہی اس لئے پیداوار بھی گھٹ گئی اور اکثر کارخانے بند ہوگئے اور بیکاری اس قدر پھیل گئی کہ امریکہ میں ۱۹۳۲ء تک بیکاروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ یہ وبا بڑھتی ہی چلی جاتی تھی اور بظاہر اس کا کوئی سر نظر نہ آتا تھا۔ بیرونی دنیا بھی اس گراوٹ کے اثر سے محفوظ نہ رہی کیونکہ چچا سام (امریکہ) نے غیر ممالک کو قرض دینا بند کر دیا اور درآمد برآمد کے ٹیکس کی شرح بہت اونچی کر دی تاکہ ملک میں باہر کا مال آہی نہ سکے اور جو کچھ کھپے وہ اپنی ہی پیداوار ہو۔ اس پالیسی سے جرمنی لڑکھڑا گیا اور دیوالئے پن کے قریب تھا کہ ملک کی باگ ڈور مشہور فاشسٹ ہر ہٹلر کے ہاتھ میں آگئی۔ اسی طرح برطانیہ اپنی برآمد بڑھانے اور سونا جمع کرنے کی ہوس میں اپنے سونے کا معیار ہی کھو بیٹھا۔ جاپان جیسے چھوٹے سے ملک نے دنیا کو اس مصیبت میں پھنسا دیکھ کر منچوریا پر حملہ کر دیا اور چین سے چھین لیا۔

اس زوال کی ابتداء میں صدر ہوور نے انہی خیالات کا اظہار کیا جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں اور قوم کو تسلّی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بحران عارضی ہے۔ یہ بھی کہا کہ "امریکی قوم نے تو بڑے بڑے نازک لمحات دیکھے ہیں اسے اس معمولی سی بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ سرسبزی اور شادابی یہیں

کہیں ہے۔ بس آیا ہی چاہتی ہے۔" لیکن جب حالت نہ سنبھلی تو صدر نے اس
کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا حالانکہ ری پبلکن پارٹی کا عام خیال یہ تھا کہ
اقتصادی معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے یہ اپنی راہ خود پیدا کر لیتے ہیں۔
صدر نے ایک فوری کانفرنس طلب کی اور کانگریس کو ہدایت کردی کہ
تعمیرِ نو کے لئے ایک مالی ادارہ قائم کیا جائے جس میں فیل ہونے والے
بنکوں اور ریلوے کمپنیوں کو قرض دیا جائے تاکہ وہ اپنا کاروبار از سرِ نو
جاری کر سکیں۔ اور مالکانِ جائداد کے لئے بھی ایک قرض فنڈ جاری کر دیا
جائے تاکہ وہ جائدادیں بنائیں اور امریکہ کے ہر شہری کو سر چھپانے کا موقع
ملے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی امدادوں سے وہ قوم کہاں تک سنبھل سکتی ہے
جو خود اپنے آپ پر اعتماد کھو بیٹھی ہو۔ بہر حال اس کشمکش و پنج میں ۱۹۳۲ء
کا الیکشن آپہنچا صدر نے دوسری مرتبہ منتخب ہونے کی کوشش کی لیکن
عوام نے اس مرتبہ ڈیموکریٹک پارٹی کے نمائندے کو پسند کیا۔

فرینکلن ڈی روزولٹ سابق صدر تھیوڈور روزولٹ کا رشتہ کا
بھائی ہوتا تھا۔ بڑے اعلیٰ اور رئیس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ہارورڈ
کا گریجویٹ بھی تھا۔ صدر ولسن کے دور میں بحری طاقت کے محکمے کا نائب
سکریٹری بھی رہ چکا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ڈیموکریٹک ٹکٹ پر نائب صدارت
کے لئے بھی کھڑا ہوا تھا لیکن نوجوانی کے دنوں میں اس کی ٹانگیں فالج
نے بیکار کر دی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔

ڈیموکریٹوں کا منصوبہ ہی مختلف تھا۔ انتخاب سے پہلے انھوں نے

کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے تو شراب پر سے پابندی اُٹھائی جائے۔ کسانوں کو امدادیں دی جائیں اور بے روزگار لوگوں کی مدد کے لئے گزارہ مقرر کیا جائے اور حکومت کے اخراجات میں کمی کر دی جائے اور جب وہ برسرِ اقتدار آگئے تو سوائے آخری کے باقی سب باتیں پوری کر دیں۔ اس حکومت کی خوبی یہ تھی یہ ہر امریکی کی ذاتی زندگی میں اُتر گئی۔ ہر چیز کی قیمت مقرر کر دی گئی۔ اُجرتوں اور تنخواہوں میں باقاعدگی پیدا کی اور کسانوں کے لئے کاشت کی ایک حد مقرر کر دی۔

صدر روزولٹ نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کہا تھا "اگر ہم دنیا میں کسی سے ڈرتے ہیں تو ڈر سے ہی ڈرتے ہیں" یہ تقریر مارچ ۱۹۳۳ء کی ہے جبکہ ملک ایک شدید قسم کے بحران میں مبتلا تھا اور تقریباً تمام بنک بند ہو چکے تھے صرف دھات کا سکہ چل رہا تھا اور کاغذی سکے کو کوئی سونگھتا بھی نہ تھا۔ صدر نے ان حالات میں بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا اور تمام بنکوں کا جائزہ لیا۔ جو واقعی دیوالیہ ہو گئے تھے انھیں بند کر دیا اور جن میں کچھ جان باقی تھی انھیں امداد دے کر دوبارہ کھلوا دیا۔ حالات کو بدلنے کے لئے یکے بعد دیگرے بہت سی تدبیریں اختیار کی گئیں اور آخر قوم سے سارا سونا اور چاندی لے کر سرکاری خزانے میں داخل کر دیا گیا کیونکہ کاغذ کے سکے کے بدلے لوگ سونا مانگتے تھے۔ دوسرے یہ کہ صدر کا پروگرام یہ تھا کہ عوام میں قوت خرید پیدا کی جائے اور اس مقصد کے لئے براہ راست مدد دی جائے۔ اس طرح معاشیات کے سدھارنے کے لئے اس کی دونوں طرف سے مدد کی تب جا کر اس بے جان جسم میں کچھ حرارت

آئی۔ بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں کو تو تعمیرِ نو کے مالیاتی ادارے سے امداد دی گئی اور ساتھ ہی ایک قانون "نیشنل انڈسٹریل ریکوری ایکٹ" پاس کردیا گیا تاکہ اشیاء کی قیمت اور نہ گرے۔ جب ۱۹۳۳ء میں یہ ایکٹ لاگو کیا گیا تو مالک و مزدور دونوں ہی خوش ہوئے کہ اب یہ بحرانی کیفیت کنارے آلگے گی۔ بے روزگاروں کی مدد کے کئی طریقے اختیار کئے گئے اور براہ راست امداد کو چھوڑ کر مختلف ذرائع سے انھیں مدد پہنچائی گئی اور زیادہ تر ملازمتیں اور کام مہیا کرکے انھیں روزگار سے لگا دیا گیا۔

کسانوں کو اُٹھانے کے لئے ان کی پیداوار کی ایک حد مقرر کردی گئی تاکہ حکومت کو فاضل غلّے کا دردِ سر مول نہ لینا پڑے اور کسان بھی پریشان نہ ہوں۔ اس پر دنیا نے اور خود امریکیوں نے بڑے اعتراضات کئے کیونکہ وہ غلّہ لینا چاہتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ خود ننگے بھوکے تھے۔ ادا کرنے کے لئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی لہٰذا امریکہ نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

گورنمنٹ نے دریائے ٹینس سی کی وادی میں جس کا رقبہ تقریباً چھ لاکھ چالیس ہزار مربع میل ہے اور جنوب کے وسط میں واقع ہے جنگ کے زمانے میں ایک بند اور ہتھیار سازی کے کارخانے تعمیر کئے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حکومت نے اس ساری تعمیر کو بیچنا چاہا لیکن بک نہ سکی۔ آخر اس بڑے وقت میں یہ جگہ بھی کام آئی اور یہاں ایک محکمہ قائم کردیا گیا تاکہ یہ محکمہ یہاں نٹ کی ہوئی مشینوں کو کھاد اور بجلی بنانے کے لئے استعمال کرے اور مزید بند

تعمیر کرے تاکہ اس علاقے کو زراعت کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ اس محکمے نے کامیابی حاصل کی اور سستی بجلی سپلائی کرنا شروع کردی۔ وہ وادی جس کو سیلابوں نے بیکار کرکے ڈال رکھا تھا بندوں کی تعمیر سے پھر زراعت کے قابل بن گئی کارخانے کھل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بنجر علاقہ گلزار بن گیا۔

اس پروگرام نے سماجی خرابیوں کی طرف بھی توجہ دی اور ایک ایسا قانون بنا دیا جس سے عام سماجی بیماریاں دور ہو جائیں۔ یہ پروگرام آج بھی جاری ہے اور اسی کے تحت ہر کام کرنے والے کو روزگار کی ضمانت دی جاتی ہے۔ بڑھاپے میں گذارے کے لئے پنشن ملتی ہے چھوٹے بچوں کے لئے اخراجات ملتے ہیں اور معذوروں (اندھے، لولے، لنگڑے وغیرہ) کو مدد دی جاتی ہے۔ مرکز کا سرمایہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں خرچ کریں اور ملک کی فلاح وبہبود کا خیال کریں۔

اس پروگرام کے مداح بہت سے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ یہ پروگرام محض ایک تجربہ ہے اور زمانے کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر جو کچھ جلد از جلد کیا جاسکا وہ کر دیا گیا ہے۔ امریکی عوام نے اس کو تسلیم کر لیا۔ اس پروگرام کے نتائج چونکہ خوشگوار رہے اس لئے فرینکلن روزولٹ کی پبلک میں بڑی واہ واہ ہوئی۔ خاص طور پر زراعت اور محنت کرنے والوں نے تو اس کی بڑی تعریف کی۔

برخلاف اس کے ایک تعداد ایسی بھی تھی جو اس پروگرام پر کوئی یقین نہ رکھتی تھی اور اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس تعداد میں عام طور پر

تجارت پیشہ لوگ شامل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو بیشک قابلِ تعریف ہے کہ حکومت ضرورت مندوں کی مدد کر رہی ہے اور اس سے تجارت کو بھی نفع پہنچے گا لیکن روپیہ کہاں سے آ رہا ہے جو اس طرح بے دریغ خرچ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ٹیکسوں کی شرح بڑھ گئی ہے لیکن وہ اتنے تو سب مِل کر بھی نہیں ہو سکتے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ کا معیار زر گر چکا ہے اور وہ یوں اربوں ڈالر کی مقروض ہوتی چلی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یقیناً معاشیاتی تباہی ہو گا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پروگرام امریکی نہیں سوشلسٹ ہے۔ بھلا ٹینس سی کی وادی کو استعمال کرنے کا حکومت کو کیا حق ہے اور وہاں جو اتنی سستی بجلی بنتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی اس کے مقابلے میں نہ آ سکے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں خرافات ہی تھیں کیونکہ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں جن کا پیشہ ہی اعتراض کرنا ہوتا ہے وہ الٹا سیدھا معقول غیر معقول کچھ نہیں دیکھتے۔ بس صرف اعتراض کرنا جانتے ہیں۔

چند بڑے بڑے تاجر بھی یہ سمجھتے تھے کہ حکومت ان کے تجارتی معاملات میں دخل اندازی کر کے ان کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے۔ یہ خیال وال اسٹریٹ (جہاں بڑی بڑی کمپنیوں اور صنعتی اداروں کے دفتر تھے) پر بہت عام تھا لہٰذا اس پالیسی کے خلاف وہیں احتجاج وغیرہ ہوتے تھے۔ صنعتی اداروں کو بھی شکایت تھی کہ مزدور کے ہاتھ میں زیادہ طاقت دے کر ہمیں مفلوج کر دیا اور اب ہم ان کے ہر اجتماعی مطالبے کو پورا کرنے پر مجبور ہیں اور اگر کسی جھگڑے

میں حکومت سے اپیل کرو تو حکومت بھی مزدوروں کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اسی وجہ سے مزدوروں کی بڑی بڑی جماعتیں بن رہی ہیں مثلاً امریکن فیڈریشن آف لیبر اور کانگریس آف انڈسٹریل آرگنائزیشن۔

یہ ساری مخالفتیں اپنی جگہ تھیں مگر ان کا ۱۹۳۶ء کے الیکشن پر کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ انھیں عام حمایت حاصل نہ تھی۔ لوگوں نے گذشتہ چار سال کی ہولناکیوں کا خیال کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ صدر روز ولٹ کے پروگرام نے کس حد تک حالات کو استوار کیا ہے۔ قصہ مختصر صدر روز ولٹ مزید چار سال کے لئے کرسئ صدارت کے لئے منتخب کر لیا گیا۔

عوام کی اتنی زبردست حمایت حاصل کرنے کے بعد صدر روز ولٹ نے سپریم کورٹ سے نمٹنے کا فیصلہ کیا کیونکہ سپریم کورٹ کے ججوں نے ایسے نازک دور میں جبکہ قدم قدم پر مشکلات کے اژدھے منہ کھولے کھڑے تھے صدر کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو نیشنل انڈسٹریل ریکوری ایکٹ اور ایگری کلچرل ایکٹ پاس ہوئے ان کو غیر دستوری قرار دیدیا کیونکہ یہ جج قدامت پسند (ری پبلکن) خیالات کے حامی تھے۔ سپریم کورٹ کے معاندانہ طرزِ عمل کا ازالہ کرنے کے لئے صدر نے تجویز کیا کہ سپریم کورٹ کے جج کی عمر ستر برس سے زیادہ نہ ہونی چاہئیے اور اگر کوئی جج اس عمر پر پہنچنے کے بعد ریٹائر نہ ہونا چاہے تو اس کے ساتھ ایک اور جج کا تقرر کردیا جائے۔ صدر کی یہ تجویز عوام کو پسند نہ آئی سب یہی سمجھے کہ اس طرح حکومت کو کوئی ٹوکنے والا نہ رہے گا۔ سینٹ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اس طرح محکمہ عدلیہ کے آزادانہ اور بے لاگ رویے میں فرق آجائے گا

اگرچہ یہ تجویز پاس نہ ہوئی مگر اس نے سپریم کورٹ کے ججوں کو اچھی طرح جھنجوڑ ڈالا اور آئندہ جہاں تک ممکن ہوسکا صدر کے پروگرام کو مناسب معانی پہنانے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۳۷ء کے اول نصف میں قیمتیں تیزی سے چڑھنا شروع ہوگئی تھیں لیکن بعد میں خود بخود اصلی حالت پر آگئیں۔ البتہ بے روزگاری میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ نتیجہ تھا دراصل صدر کے ڈکٹیٹرانہ رویے کا جس کا مظاہرہ سپریم کورٹ کے معاملے پر ہوا۔ اس سے تاجر اور کارخانہ دار محتاط ہو گئے کہ نہ معلوم ان کی کب گرفت ہو جائے۔ بہرحال یہ پروگرام قوم پر وہ بحالی اور شادابی لانے میں ناکام رہا جس کی اُمید تھی کیونکہ اس پر جتنی کثیر رقم خرچ کی گئی۔ اگر وہ عام حالات میں خرچ کی جاتی تو اس کے نتائج اس سے کئی گنا اچھے بر آمد ہوتے۔ کون جانے کہ جنگ سے پہلے کے حالات میں ہی یہ خرچیلا پروگرام زیادہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ امریکہ نے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لے کر ملک کے سامنے دولت بھی پیش کی اور اس سے بھی زیادہ وسیع پروگرام۔

صدر کے پروگرام کی خارجہ پالیسی بھی اتنی ہی مضبوط تھی جتنی داخلہ۔ صدر ہور کی پالیسی یہ تھی کہ اپنے پڑوسیوں کے اچھے پڑوسی بنے رہو اور اسی کو موجودہ صدر روزولٹ نے اپنایا اور پڑوسی ملکوں کے داخلی معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا کیونکہ یہ نااتفاقی اور تلخی کا باعث تھا۔ کیوبا کو اپنی حفاظت سے نکال کر مکمل آزادی دیدی گئی۔ اسی طرح اور دوسرے معاملات میں بھی امریکہ نے اپنی نیک نیتی کا اظہار کیا اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ جب فلپائن کے

کے لوگ اپنے معاملات سنبھالنے کے لئے تیار ہو جائیں گے اسی وقت وہ
فلپائن کو بھی آزاد کر دے گا۔ اسی دوران میں کانگریس نے امورِ مملکت کے
سکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ دوسرے ملکوں سے تجارتی معاہدات کرے اور ٹیرف
(درآمد برآمد ٹیکس) میں جتنی کمی دوسرے ملک امریکہ میں تجارت کرنے کے لئے
کرائیں اتنی ہی کمی وہ دوسرے ملکوں میں امریکہ کی تجارت کے لئے کرائے۔
اس قسم کے معاہدات سے بین اقوامی تعلقات بھی درست ہوتے تھے اور تجارت
میں بھی جان پڑتی تھی۔

ایک طرف یہ معاہدات ہو رہے تھے اور دوسری طرف دنیا پر جنگ کے
بادل منڈلا رہے تھے۔ جرمنی کا ڈکٹیٹر ہٹلر قسم کھا چکا تھا کہ جرمنی نے جو کچھ معاہدہ
ورسلز میں کھویا ہے وہ اُسے دوبارہ حاصل کرے گا چاہے اسے جنگ ہی کیوں
نہ کرنی پڑے۔ اس کا دوست میسولینی پہلے ہی حبش کے ساتھ جنگ میں مصروف
تھا۔ اسپین خود اپنی ہی آگ میں جل رہا تھا کیونکہ ملک بھر میں بغاوت
پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر جاپان نے چین کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ امریکہ ابھی
پہلی جنگ عظیم کے اثرات سے ہی پوری طرح سنبھل نہ پایا تھا۔ لہذا دنیا کے
ان حالات کا امریکہ میں کوئی خاص ردِ عمل نہیں تھا اور لوگ قطعی جنگ کے
حق میں نہ تھے۔ پہلی ہی جنگ کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس
میں امریکہ نے زبردستی ٹانگ اڑائی تھی اور ۱۹۳۵ء کے قریب یہ مطالبہ
بھی ہونے لگا تھا کہ جنگ بالکل نہ کی جائے اور اسی مطالبے کے تحت
کانگریس نے اس مقصد کے لئے دو قانون بھی پاس کر دیئے تھے۔ پہلے جانسن

ایکٹ کی رو سے کسی ایسے ملک کو قرضہ دینے سے روک دیا گیا تھا جس نے پہلی رقم بے باق نہ کی ہو۔ اور دوسرا غیر جانبداری ایکٹ تھا جس کی رو سے کسی بھی ایسے ملک کو لڑائی کا سامان فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا جو لڑائی میں مصروف ہو یا لڑائی کی تیاری کر رہا ہو اور امریکیوں کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ سوائے امریکی جہازوں کے کسی اور جہاز پر سفر نہ کریں۔ اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو نتائج کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ صدر روزولٹ نے ان قوانین کو منظور بھی کر لیا تھا۔ لیکن جب ہٹلر نے رہائن لینڈ دوبارہ مسلح کر دیا اور یہ بالکل واضح ہو گیا کہ وہ یوروپ پر حملہ کرنے والا ہے تو اس نے اپنی ۱۹۳۷ء کی تقریر میں کہا تھا "دنیا میں لاقانونیت کی وبا پھیل رہی ہے۔ ..... کوئی یہ نہ سمجھے کہ امریکہ اس وبا سے بچ جائے گا" اور وقت نے ثابت کر دیا کہ روزولٹ کا اندیشہ درست تھا۔

جرمنی میں جو یہودی رہتے تھے ان پر ظلم، جارحانہ تنظیم اور جمہوریت کی تحقیر نے اس کے ارادوں کو بالکل ظاہر کر دیا تھا۔ جن ملکوں سے اس کی پرانی چشمک چلی آتی تھی وہ اس کی ان جابرانہ علامتوں سے سمجھ بیٹھے تھے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ وہ حملہ کر دے گا۔ میونچ کانفرنس میں اس کو خوش کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن ناکام رہی۔ اور آخر کار ستمبر ۱۹۳۹ء میں جیسے ہی اُس نے پولینڈ پر حملہ کیا انگلینڈ اور فرانس نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ صدر روزولٹ حالات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا نہ وہ جانتا تھا کہ اگر آگے بڑھ کر اس آگ کو نہ روکا گیا تو یہ آگ گھر

تک پہنچ جائے گی اس لئے اس نے کانگریس کو ہدایت کی کہ جنگ نہ کرنے کے دونوں قانون منسوخ کردیئے جائیں تاکہ وہ اتحادیوں کو سامان جنگ سپلائی کرسکے۔ کانگریس نے اس شرط کے ساتھ یہ قانون منسوخ کردیئے کہ جو سامان خریدے وہ نقد قیمت ادا کرے اور اپنے جہازوں میں خود ہی لاد کر امریکہ سے لے جائے۔ یہ تھا دوسری جنگِ عظیم کی ابتداء کا مختصر حال۔

اگرچہ واقعات اور حالات مختلف تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ۱۹۱۴ء پھر پلٹ آیا ہے۔ نو مہینے خاموشی سے تیاری کرنے کے بعد نازیوں (جرمنوں) نے اچانک فرانس پر حملہ کردیا۔ ناروے اور ڈنمارک جیسی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تو ویسے ہی کانپ اٹھیں اور ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد برطانویوں کو برِ اعظم یورپ سے نکال کر ڈنکرک تک دھکیل دیا۔ فرانس چونکہ گھر چکا تھا اس لئے اب برطانیہ اٹلی اور جرمنی جیسے طاقتور دشمنوں کے آگے اکیلا رہ گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر جاتی ہے کہ یا تو یہ ہتھیار ڈال دے گا یا اسے زمین، ہوا اور سمندر پر ہر جگہ شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ امریکی اخبارات میں برطانیہ کی پتلی حالت پڑھتے تھے اور بمباری کا شکار بنے ہوئے لندن سے ریڈیو پر خبریں سنتے تھے اور آپس میں مشورے کرتے تھے کہ حکومت امریکہ کو کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انگلینڈ کی لڑائی ہماری لڑائی ہے اگر اسے شکست ہوگئی تو اس کا دوسرا شکار ہم ہی ہوں گے۔

لیکن دوسرا گروپ مصر تھا کہ امریکہ کا جنگ سے الگ رہنا ہی مناسب ہے۔ اور ان دونوں میں کوئی جیتے کوئی ہارے ہمارے لئے یکساں ہی ہے مگر صدر روز ولٹ کی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۴۰ء میں صدر نے پچاس جہاز برطانیہ کو دیئے اور ان کے بدلے میں چند اہم بحری اڈے لے لئے۔ صدر کے اس اقدام پر بہت سے امریکیوں نے اعتراض کیا اور بہت سوں نے اس پر اظہار مسرت کیا۔ اس اثناء میں کانگریس نے اپنے ملکی دفاع کے لئے فوجی بھرتی کا ایک قانون پاس کر دیا اس قانون کے پاس ہوتے ہی دسیوں فیکٹریاں سامان جنگ بنانے میں مصروف ہوگئیں۔ یہ تیاریاں ابھی جاری ہی تھیں کہ ۱۹۴۰ء کا صدارتی الیکشن آپہنچا۔ ملک بہت ہی پر خطر حالات سے گذر رہا تھا اور اس وقت نئے صدر کا انتخاب مزید مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ امریکی بھی اس نزاکت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے روز ولٹ ہی کو تیسری صدارت کے لئے موقع دیا۔

۱۹۴۱ء جیسے ہی شروع ہوا جرمنی اور اٹلی کا مقابلہ ناممکن نظر آنے لگا۔ ادھر جاپان نے مشرق بعید میں دست درازیاں شروع کر دیں۔ یوروپ میں جرمنی نے یونان اور یوگوسلاویہ فتح کرنے کے بعد روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور دور تک اس کے علاقے میں دندناتا چلا گیا لیکن رودبارِ انگلستان کے اس پار برطانیہ ابھی جی رہا تھا۔

تیسری صدارت کی افتتاحی تقریر میں صدر روز ولٹ نے کہا "ہر حقیقت پسند جانتا ہے کہ آج جمہوری طریق زندگی دنیا کے ہر خطے میں گھرا ہوا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ ہمارا مستقبل، ہمارا تحفظ، ہمارا ملک اور ہماری جمہوریت خطرے سے باہر نہیں ہیں۔" اور اس کے بعد صدر روز ولٹ نے ڈکٹیٹر کی پیش قدمی کے پیشِ نظر فوجی تیاریوں کا حکم دے دیا اور چار بڑوں (برطانیہ، فرانس، چین، امریکہ) کی آزادی کے لئے ایک وسیع پروگرام پیش کیا۔ اس میں تحریر و تقریر کی آزادی اور خوف و احتیاج سے چھٹکارا تجویز کیا گیا تھا۔ کانگریس نے فوراً ہی اس کی منظوری دے دی اور صدر کو اربوں کا جنگی سامان اور سرمایہ تقسیم کرنے کی اجازت دے دی تاکہ نازیوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ طے کر لیا گیا کہ جنگ کے بعد کارآمد سامان یا تو وہ واپس کر دیں یا اسے خرید لیا جائے گا۔ اس وقت یہ سوال بھلا دیا گیا کہ جسے ہم قرض دے رہے ہیں اس میں واپس کرنے کی سکت بھی ہے یا نہیں۔ اس وقت تو صرف یہ مقصد تھا کہ نازیوں کو ان کے ارادوں میں ناکام بنا دیا جائے اور اور قرضوں کے بار سے دوسری قوموں سے جنگ کے بعد کے تعلقات پر ناخوشگوار اثر نہ پڑنے دیا جائے۔

جنگی سامان بنانے میں امریکی تاجروں نے بہت اہم پارٹ ادا کیا اور ان کے ساتھ بحری فوجوں نے بحرِ اوقیانوس پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے گرین لینڈ، آئس لینڈ اور شمالی آئرلینڈ میں فوج کے اڈّے قائم کر دئے تاکہ اس راستے سے آنے جانے والے جہازوں کی مدد کی جا سکے۔

اگست ۱۹۴۱ء میں صدر روز ولٹ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل سے ملے۔ یہ ملاقات سمندر پر ہوئی۔ ان دونوں دماغوں نے ایک معاہدہ اٹلانٹک

چارٹر کے نام سے کیا جس میں فتح حاصل کرنے کا خاکہ تھا اور جنگ کے آئندہ اقدامات کے متعلق کچھ فیصلے تھے۔ دراصل ان دونوں لیڈروں کی اس ملاقات کا نتیجہ ہی موجودہ متحدہ اقوام ہے (یونائیٹیڈ نیشنز)

اگرچہ امریکہ اور جرمنی کے درمیان بحراوقیانوس پر اختلافات بڑھتے جا رہے تھے لیکن امریکہ تک جنگ کے پہنچنے کے دوسرے ہی اسباب تھے۔

جاپان جب فرانسیسی انڈو چائنا اور تھائی لینڈ کی طرف بڑھا تو امریکہ نے اسے تنبیہ کی کہ اپنے جارحانہ اقدام سے باز آجائے اس کے جواب میں جاپان نے اپنے دو سفیر بات چیت کرنے کے لئے واشنگٹن بھیجے۔ یہ بات چیت ابھی چل ہی رہی تھی کہ جاپان کے بحری اور ہوائی جہاز ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر اور ہوائی پر چڑھ آئے اور امریکی بیڑے پر حملہ کر دیا۔ کئی جنگی جہاز یکے بعد دیگرے غرق کر دیئے اور تقریباً دو ہزار جوان موت کے گھاٹ اُتار دیئے اگر یہاں تک بھی بات ختم ہو جاتی تو شاید معاملات نہ بگڑتے مگر جاپانیوں نے اس کے بعد امریکہ کی دوسری فوجی چوکیوں فلپائن اور گوام پر دھاوا بول دیا۔ اس پر اب تک غور نہیں کیا جاسکا کہ کیا پرل ہاربر کے امریکی فوجیوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی یا امریکہ کے دارالحکومت نے انھیں پہلے سے اس اچانک حملے کے لئے تیار رہنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو بہرحال امریکہ کے جنگ میں آنے کی وجہ دراصل جرمنی کے بجائے جاپان ہے۔ اس اچانک حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸ دسمبر ۱۹۴۱ء کو کانگریس نے صدر کی مرضی سے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور

اٹلانٹک چارٹر کی رو سے چونکہ برطانیہ اور امریکہ کا مفاد اور تحفظ مشترک قرار دے دیا گیا تھا اس لئے انگلینڈ نے بھی یہی کیا۔ امریکہ کے اعلان جنگ سے جرمنی کے ایک مددگار (جاپان) پر چوٹ پڑتی تھی اس لئے نازیوں نے امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا اور اس طرح دنیا کی عظیم ترین اور حیران کن جدوجہد ایک نئے دَور میں داخل ہوئی۔

دسواں باب

موجودہ زمانہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ نے چارٹر کے مطابق یکم جنوری ۱۹۴۲ء سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا جبکہ امریکہ اور پچیس دوسرے ملکوں کے نمائندے جو مرکزی طاقتوں سے برسرِ پیکار تھے سر جوڑ کر واشنگٹن میں بیٹھے تھے اور متحد ہو کر امن کو جیتنے کا عہد کیا تھا۔ یہ میٹنگ در اصل اٹلانٹک چارٹر ہی کا نتیجہ تھی جس میں دنیا کے اقوام کو متحد کرنے کے لئے امریکہ ہی نے تجویز رکھی تھی۔ اس امن کے عہد نامے اور جنگی ہولناکیوں کے اختتام میں تقریباً ساڑھے تین برس کا فاصلہ ہے۔ اس جنگ میں جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ اس نے پہلی جنگ عظیم کے مقابلے میں اِس جنگ میں بہت زیادہ نقصان اُٹھایا۔ بجائے چالیس لاکھ فوج کے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ فوج رکھنی پڑی جس میں کچھ تعداد عورتوں کی بھی شامل ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں کام آنے والوں

کی تعداد تین لاکھ چونسٹھ ہزار ہے جبکہ اس جنگ نے دس لاکھ سے زیادہ امریکی جوانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ پہلے قومی قرضے کی مقدار صرف ۲۷ ارب تھی اور اس جنگ میں قومی قرضہ دو کھرب اناسی ارب تک پہنچ گیا۔

جنگی سامان کی تیاری اور فوجی بھرتی پرل ہاربر پر حملے سے پہلے کچھ زیادہ تیزی سے نہیں ہو رہی تھی اور قوم اس اچانک حملے کے لئے قطعی تیار نہ تھی اور نہ یہ اُمید تھی کہ امریکہ کو یورپ اور ایشیا کے دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ جاپان کے حملے کی کامیابی کی دراصل وجہ ہی یہ تھی اور اسی وجہ سے امریکہ کو نقصان بھی کافی برداشت کرنا پڑا اور فلپائن بھی دینا پڑا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اس اچانک حملے کی صورت میں بھی جنرل ڈگلس میک آرتھر کی فوجوں نے سوائے ہوائی کے اور ہر مقام پر بہت اچھا مقابلہ کیا۔ اس کے بعد جاپان الاسکا کے جزیروں میں گھس آیا تھا اور شمالی امریکہ پر ہاتھ صاف کرنے کی سوچ رہا تھا کیونکہ برطانیہ کے ہاتھ سے سنگاپور اور ملایا چھین کر اور پرتگال کے جزائر شرق الہند پر قبضہ کر لینے سے اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔

نئے جہازوں اور ہوائی جہازوں کی کمک مل جانے پر ۱۹۴۲ء میں امریکہ نے بحرالکاہل پر دفاع سخت کر دیا اور گوڈاکنال پر حملے کے ساتھ ہی جنگ میں تیزی آ گئی اور امریکہ نے نہ صرف اپنے علاقے واپس لینے کے لئے جدّوجہد شروع کر دی بلکہ خود جاپان کے گھر پر جا چڑھا۔ طرفین نہایت بے جگری اور خونریزی بلکہ بے رحمی سے لڑے اور امریکہ کے ہاتھ جنگلوں اور سمندر کے ساحلوں سے کچھ قیدی بھی لگے۔ چین بھی امریکی امداد کے بل پر برابر لڑے

جا رہا تھا اور ادھر برما میں برطانوی فوجیں سینہ سپر تھیں غرضیکہ جاپان کئی طرف سے الجھا ہوا تھا۔

صدر روزولٹ جانتا تھا کہ جاپان کو شکست دینا بہت ضروری ہے لیکن یوروپ پر حملوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اس لئے اُس نے فوج کی ایک زبردست طاقت اس محاذ پر لگا دی اور نومبر ۱۹۴۲ء میں امریکی جنرل آئیزن ہاور اور برطانیہ نے مل کر شمالی مغربی افریقہ پر حملہ کر دیا اور نازی جنرل رومیل کو افریقہ سے دھکیل کر باہر نکال دیا اور پھر یہاں سے یہ کامیاب جوان سسلی (صقلیہ) سے ہوتے ہوئے اٹلی کی طرف بڑھے اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ اٹلی کو ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی اگرچہ جرمنی کی کچھ فوجیں برابر وہاں اڑی رہیں اور جنگ کے بالکل اخیر تک وہیں جمی رہیں۔

۱۹۴۳ء میں صدر روزولٹ، وزیر اعظم چرچل، روسی وزیر اعظم جوزف سٹالن اور چین کا جنرل چیانگ کائی شیک جنگی اقدامات اور جنگ کے بعد یونائیٹڈ نیشنز کا پروگرام طے کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روسی فوجیں جرمنوں پر سخت حملے کر رہی تھیں اور ان کو برابر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لہٰذا اسی میٹنگ میں روسیوں سے وعدہ کیا گیا کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ایک دوسرا محاذ کھول دیا جائے گا تاکہ دشمن کی طاقت بٹ جائے اور اس کا دفاع ہلکا پڑ جائے۔ یہ وعدہ ۶ جون ۱۹۴۴ء کو پورا کیا گیا اور امریکہ، برطانیہ، کناڈا کی مشترک افواج پر مشتمل ایک بھاری جمعیت جنرل آئزن ہاور کی کمان میں دیدی گئی۔ جنرل نے مناسب موقع دیکھ کر

رود بار انگلستان کو پار کر کے نارمنڈی پر حملہ کر دیا جو فرانس کے ساحل پر واقع ہے۔ جرمنوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن فضائی حملوں نے اس کی رسد کی راہیں روک کر اس کا دھڑ توڑ دیا اور آخر فرانس کو چھوڑ کر اس نے رہائن میں پناہ لی۔ اس اثناء میں بحرالکاہل میں جنرل میک آرتھر اپنی شجاعت سے فلپائن کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا اور نیوگنی کے علاوہ کئی جزیرے جاپانیوں سے چھین لئے تھے۔ اب جاپانیوں کا آخری سہارا چین اور برما رہ گئے تھے جہاں وہ قدرے ٹک سکتے تھے لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ کی فوجوں نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی اور اوکی ناوا اور آیوجیما پر قبضہ کرنے کے بعد ہزاروں بمبار ہوائی جہاز لے کر خود جاپان کے دروازے پر پہنچ گئیں۔

مختصر یہ کہ دوسری جنگ عظیم اس طرح اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی نازی ہٹتے جاتے تھے اور بار بار سنبھلنے کی کوشش میں سخت سے سخت حملے کرتے جاتے تھے اور بلجیم پر تو ۱۹۴۴ء میں عین کرسمس کے دن حملہ کیا لیکن ایک دفعہ جو قدم اُکھڑ گئے سو اُکھڑ گئے۔ مشرقی محاذ پر بھی یہی حال تھا اور روسی فوجیں تو پولینڈ سے گزر کر خود جرمنی کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ دوسری طرف سے امریکن برابر دھکیلتے چلے جا رہے تھے حتیٰ کہ روس اور امریکہ کی فوجیں جرمنی کے عین قلب میں جا کر ملیں۔

ہٹلر نے جب روسی فوجوں کو برلن میں داخل ہوتے دیکھا تو اس نے گرفتاری سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی۔ جرمنی کی جو کچھ طاقت بچی کھچی اِدھر

اُدھر رہ گئی تھی اُس نے بھی ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح یوروپ میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

کاش روزولٹ اس فتح کو دیکھ سکتا جس کے لئے اس نے اس قدر دوڑ دھوپ کی تھی لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۹۴۴ء کے الیکشن میں چوتھی مرتبہ صدارت جیت کر یالٹا میں وزیراعظم اسٹالن سے ملنے چلا گیا اور وہاں سے یہ طے کر کے کہ روس کو جاپان پر حملہ کر دینا چاہیے ایک اہم مشورے کے لئے چین چلا گیا۔ جب وہاں سے لوٹا تو بہت ہی لاغر ہو چکا تھا اور تھکن نے اس پر غلبہ پا لیا تھا لہٰذا قدرے سکون کی خاطر وارم سپرنگ (جارجیا) چلا گیا اور دماغ سے خون آنے کی وجہ سے وہیں ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ قوم کو اس حادثۂ عظیم کا سخت صدمہ ہوا لیکن اس صدمے میں صدر روزولٹ کے شروع کئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچانا نہیں بھولی چنانچہ نائب صدر ہیری ٹرومین کو روزولٹ کی جگہ صدر بنایا گیا۔

مشرق میں جاپان کی جدو جہد جاری تھی اگرچہ سارے مقبوضات اس سے چھن گئے تھے مگر اپنے ملک کو بچانے کے لئے جاپانی اپنی امکانی کوشش کر رہے تھے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ جاپان پر حملہ کرنا یقیناً مہنگا پڑتا چنانچہ نہ حملہ کیا گیا اور نہ عام قسم کی بمباری کی گئی بلکہ یوں ہی

---

[۱] اس وقت جنگ جاری تھی۔ مترجم

رسمی سی بمباری کی گئی۔

جنگ کے ابتدائی دور سے امریکہ اور نازی اس مجنونانہ مقابلے میں مبتلا تھے کہ دیکھیں ایٹم بم پہلے کون بناتا ہے لیکن دراصل ایٹم کے متعلق سائینس داں تقریباً پچاس برس سے تلاش و جستجو کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں برطانیہ اور امریکہ نے ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو لاس الاماس (نیو میکیکو) کے میدانوں میں اپنی آخری معلومات پیش کیں۔ تاریخ میں پہلا ایٹم بم اس روز مشاہدین کے سامنے چلایا گیا جو اس کے ہولناک نتائج دیکھکر خوفزدہ ہو گئے اس کے دس دن بعد جاپان کو متنبہ کیا گیا کہ وہ جنگ کو خواہ مخواہ طول نہ دے اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے یا پھر فضائی حملوں کے ذریعہ مکمل تباہی کے لئے تیار ہو جائے۔ اس تنبیہ میں کسی ایٹمی ہتھیار کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا لیکن ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ کے ایک ہوائی جہاز نے ہیروشیما (جاپان) پر ایٹم بم گرا دیا جس سے تین لاکھ چونتیس ہزار انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار زخمی ہوئے اور اس کے علاوہ دسیوں شہر چٹیل میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ مرے پر سو درّے کے مصداق اب ۸ اگست کو روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور منچوریا اور کوریا کو روند ڈالا۔ ۹ اگست کو امریکہ نے دوسرا ایٹم بم ناگاساکی (جاپان) پر مارا جس سے تقریباً اسی ہزار آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس بے پناہ تباہی سے گھبرا کر جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے امریکہ کو ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو مطلع کر دیا کہ جاپان ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ جیسے ہی جاپانی سفیر یکم

ستمبر ۱۹۴۵ء کو امریکہ کے جنگی جہاز "مسوری" پر شکست نامے پر دستخط کرنے کے لئے چڑھا فتح کا اعلان کر دیا گیا۔ جاپان کے نہ صرف تمام مقبوضات چھین لئے گئے بلکہ خود جاپان پر قبضہ کر لیا گیا۔ دنیا نے اس خونخوار جنگ کے خاتمے پر خوشی تو منائی لیکن ساتھ ہی اس پر افسوس بھی کیا کہ ایٹم کا زمانہ آن پہنچا۔ یہ دوسری بحث ہے کہ وہ اچھا ثابت ہوگا یا بُرا۔

متحدہ اقوام کے لیڈروں کے اتحاد عمل اور امن ہونے پر مِل جُل کر کام کرنے کے ارادوں سے یہ ضروری ہو گیا کہ مستقل طور پر بین اقوامی ادارہ قائم کیا جائے جو لیگ آف نیشنز سے زیادہ کامیاب ثابت ہو۔ امریکی قوم نے بھی اس ضرورت کو پوری طرح محسوس کیا اور اس کی حمایت کی کیونکہ یہ مرحوم صدر روز ولٹ کا تخیل تھا جو ری پبلکن اور ڈیموکریٹ دونوں کو پیارا تھا۔ چنانچہ ابتدائی مشوروں کے بعد مرکزی طاقتوں کے مخالف پچاس ملکوں کے نمائندے اپریل ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو میں اکٹھے ہوئے تاکہ متحدہ اقوام کے مقاصد کا ایک عہدنامہ (چارٹر) تیار کریں۔ اس چارٹر کی رو سے متحدہ اقوام کی ایک مجلس اعلیٰ تجویز کی گئی اور اس مجلس کا نام سیکورٹی کونسل رکھا گیا اس کونسل کو امن کی بحالی کے لئے مؤثر اقدام کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو اِدارے اور بنائے گئے یعنی جنرل اسمبلی اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس۔ جنرل اسمبلی کو تمام ملکوں کے نمائندوں کی مجلس رکھا گیا جس میں متنازعہ مسائل پر بحث ہو اور اس کے ازالے کی سفارش کی جائے۔ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس ایک ایسی عدالت بنائی گئی جس میں تمام ملکوں کے قانونی

جھگڑے طے کئے جائیں۔ ایک دفتران تمام اداروں کا کام سنبھالنے کے لئے بنایا جسے سکریٹریٹ کہتے ہیں۔ وہ علاقے جو خود مختار نہیں ہیں ان کے حقوق کی نگہداشت کے لئے ایک ٹرسٹی شپ کونسل بنادی گئی اوران اداروں کے ماتحت بہت سے دفاتر اور محکمے بنائے گئے مثلاً ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن، انٹرنیشل لیبر آرگنائیزیشن، انٹرنیشنل بنک یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹفک کلچرل آرگنائیزیشن۔ اوریہ سب متحدہ اقوام کے دفاتر کی امداد اور اعانت کے لئے کیا گیا تاکہ یہ اپنی خدمات سے دنیا کی فلاح وبہبود کے لئے مفید ثابت ہوں۔

سیکورٹی کونسل میں گیارہ ملکوں کے نمائندے لینے طے کئے گئے جو جومتحدہ اقوام کے ممبر ہوں اور پانچ بڑی طاقتوں (امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اورچین) کی مستقل نشستیں منظور کی گئیں اورمقرر کردیا گیا کہ کسی بھی فیصلے کے لئے گیارہ میں سے سات ممبروں کا ہم خیال ہونا ضروری ہے لیکن بڑی طاقتوں میں سے ہر ایک کو کونسل کے کسی فعل کو رد کرنے کا اختیار دیدیا گیا۔ لیکن اس اختیار کو آرگنائزیشنوں کے معاملات پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ طاقت ان بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں اس لئے دی گئی کہ ان میں سے کسی کو اپنی مرضی کے خلاف متحدہ اقوام کے اختیار کے آگے بے بس نہ ہونا پڑے۔

جولائی ۱۹۴۵ء میں امریکہ کے سینٹ نے اس چارٹر کی تصدیق کردی جس کی رو سے متحدہ اقوام کے مل کر بیٹھنے کا مندرجہ بالا خاکہ تیار کیا گیا تھا۔ دوسرے ملک بھی اس ادارے میں جلدی آملے اور جنوری ۱۹۴۶ء میں اس

بین اقوامی ادارے نے کام کرنا شروع کر دیا۔ پہلا سکریٹری جنرل ناروے کے ٹرگیویلی کو مقرر کیا گیا اور طے کیا گیا کہ یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن کا صدر مقام نیویارک شہر میں رکھا جائے۔

جنگ کے ختم ہونے اور یو۔این۔او کے قائم ہو جانے کے بعد دنیا نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب امن ہی رہے گا لیکن ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ دنیا میں دو بڑی تحریکیں اُٹھ کھڑی ہوئیں جو اپنے اغراض و مقاصد میں آپس میں ٹکراتی تھیں۔ ایک تھی جمہوریت جس کا علمبردار امریکہ تھا اور دوسری اشتراکیت تھی یعنی کمیونزم جس نے روس میں پرورش پائی تھی۔ یو۔این۔او اور دوسری جگھوں پر سوال ہوئے لیکن یہ دونوں متضاد نظریئے متفق نہ ہو سکے۔ روس نے پولینڈ اور بلقان پر اپنا تسلّط جمالیا تھا اور بقول چرچل ایک آہنی پردہ پڑ گیا تھا جس نے مغرب کی جمہوریتوں کو روسی اشتراکیت سے بالکل الگ کر دیا تھا۔

دونوں ملک جن پر یہ آہنی پردہ تلوار کی طرح گرا وہ جرمنی اور آسٹریا ہیں۔ یعنی یہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح الگ الگ ہو گئے جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ اگرچہ ان دونوں ملکوں پر برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس کا مشترکہ قبضہ ہے اور دونوں کو دوبارہ متحد کرنے کے لئے انتھک کوششیں بھی ہو چکی ہیں اس قسم کی پُراسرار اور درپردہ باتیں جرمنی کے معاملے میں دیکھنے میں آئیں۔ جنگ کے بعد جرمنی کے جنگی مجرموں پر مقدمہ چلانے اور انھیں سزا دینے پر چاروں مذکورہ طاقتیں متفق تھیں اور فیصلہ ہو گیا تھا

کہ اس کو نہتا کر دیا جائے تاکہ آئندہ پھر دنیا کے امن میں خلل ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ راز کھلا کہ روس جرمنی کے متعلق کسی بھی تجویز سے متفق نہیں ہے وہاں وہ صرف کمیونزم لانا چاہتا ہے۔ جمہوری طاقتوں کا خیال یہ تھا کہ صنعتی مغربی جرمنی اپنے زراعت پیشہ مشرقی حصوں سے آپس میں تجارت کرے گا تو اس کی خوش حالی اور ترقی میں اضافہ ہوگا مگر سٹالن نے اس تجارت پر پابندی لگا دی اور مشرقی جرمنی کو اپنے آہنی پردے کے پیچھے چھپا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دو دنیاؤں میں بٹ کر رہ گئی ایک روس جو بجائے خود ایک دنیا اور دوسری دنیا کی تمام اقوام۔

یو، این، او میں امریکہ اور روس کی اس سے بھی زیادہ ایک اہم معاملے پر جھڑپ ہوگئی ــــ ایٹمی طاقت کو کنٹرول کرنے پر ــــ امریکہ اس پر تیار تھا کہ کوئی مناسب بین اقوامی انتظام کیا جائے تو وہ اپنی ایٹمی طاقت اور ایٹم بم کے ذخیرے کا نہ صرف معائنہ کرا سکتا ہے بلکہ اس سے دستبردار بھی ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکوں کو یہ پیشکش نہایت معقول معلوم ہوئی لیکن روس کا اصرار یہ تھا کہ امریکہ پہلے اپنے ایٹمی ذخیرے کو تباہ کرے اور اس کے بعد یہ مسئلہ سیکورٹی کونسل میں پیش کیا جائے۔ اس اعتراض کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ کونسل اس ذخیرے کا پوری طرح معائنہ نہیں کر سکے گی۔ لیکن قدرتی طور پر دنیا کے سامنے یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ اگر امریکہ اپنے ایٹمی ذخیرے کو تباہ کر بھی دے اور آیندہ بھی ایٹم بم نہ بنائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ روس چپکے چپکے ایٹمی طاقت جمع نہیں کرے گا۔ غرضیکہ اس قسم کے شکوک وشبہات کی

فضا نے بین اقوامی تعلقات کو خراب کر دیا اور جب کہ دوسری جنگِ عظیم کے سپاہی ابھی گھروں کو لوٹ ہی رہے تھے کہ لوگوں نے تیسری جنگ عظیم کے متعلق پیشین گوئیاں شروع کر دیں۔

جنگ کے بعد امریکہ کے داخلی حالات یہ تھے کہ حکومت تجارت کو اپنے معمول پر جلد از جلد بحال کرنا چاہتی تھی تاکہ شہری زندگی لوٹ آئے اور جنگ کے اثرات لوگوں کے دماغوں سے مٹ جائیں۔ اسی لئے ایک کروڑ دس لاکھ فوجیوں سے صرف دس لاکھ رکھ کر باقی سب کو شہری زندگی اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ لوگوں نے دنیا کی مکدر فضا کے پیش نظر اعتراض بھی کیا کہ ایسا کرنا سخت غلطی ہوگی لیکن ایک تو خود فوجی یہی چاہتے تھے دوسرے یہ کہ رائے عامہ بھی اسی کے حق میں تھی۔

جنگ کے زمانے میں ملک صرف جنگ کی ضرورت کی چیزیں بناتا رہا۔ اس وجہ سے شہری زندگی کی ضروریات کی چیزیں کم پڑ گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکانات کی بھی قلت ہو گئی۔ یہ یقینی ہے کہ جو چیز کمیاب ہوگی اس کی قیمت چڑھ جائے گی۔ چنانچہ امریکہ میں بھی شہری زندگی کی چیزوں کی قیمت میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا اسی وجہ سے صدر ٹرومین نے قیمتوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے ایک محکمہ کھول دیا تھا کہ محض کمیابی کی وجہ سے کوئی چیز مہنگی نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ مالکوں اور مزدوروں نے بھی پوری کوشش کی کہ قیمتیں چڑھنے نہ پائیں لیکن اس کے باوجود بھی مہنگائی کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی اجرتوں اور تنخواہوں

میں اضافے کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس مطالبے میں کانوں میں کام کرنے والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا حالانکہ چھوٹی کی صنعتوں کے مزدوروں کو اس سلسلے میں کافی سہولتیں دیدی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانے والوں نے بھی مال کی قیمت بڑھانے پر اصرار کیا کہ مال پر لاگت زیادہ آرہی ہے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے صدر کے کہنے پر کانگریس نے کنٹرول ختم کر دیا۔ کنٹرول ختم ہونا تھا کہ قیمتیں بڑھنی شروع ہوگئیں۔ ان بے چینیوں۔ ہڑتالوں اور مکانوں کی قلت نے عوام کے ذہن کو ۱۹۴۶ء کے کانگریس الیکشن میں بھر ری پبلکنوں کی طرف موڑ دیا اور چودہ سال کے بعد ری پبلکنوں کو پھر ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو اور سینٹ میں اکثریت حاصل ہوگئی۔ پرجوش ری پبلکن رابرٹ ٹافٹ کو سینٹ کا لیڈر چنا گیا۔ یہ رابرٹ ٹافٹ سابق صدر ولیم ہورڈ ٹافٹ کا بیٹا تھا۔ صدر روز ولٹ کے بنائے ہوئے نئے پروگرام میں اس نے کچھ تبدیلیاں کیں یعنی انکم ٹیکس میں کمی کردی اور مزدوروں کی یونینوں کو کسی حد تک پابند اور محدود کر دیا تاکہ آئے دن کی ہڑتالوں اور مظاہروں سے نجات مل جائے لیکن جہاں اس نے مزدوروں کو پابند بنایا وہاں کارخانہ داروں کو بھی من مانی کارروائیاں کرنے سے روک دیا۔ کسی بھی ہڑتال کے لئے کم از کم دو مہینے کا نوٹس ضروری قرار دے دیا تاکہ اس عرصے میں کوئی باہمی سمجھوتہ ہو سکے اور اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہوگیا کہ یونین کے کارکن ایک حلف نامہ داخل

کریں کہ ہڑتالی کمیونسٹ نہیں ہیں اگرچہ اس پر مزدوروں نے احتجاج کیا لیکن تجربے نے ثابت کردیا کہ اس قانون سے مزدور تحریکوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ یونین کے کارکنوں کی آزادی میں فرق ضرور آتا تھا جو ان کے اپنے ہی مفاد میں تھا۔

مسلح افواج کو بہتر بنانے کے لئے کانگریس کی تجویز تھی کہ فوجی تربیت عام کردی جائے لیکن عوام نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ بہرحال بحری، بری اور ہوائی فوج کے تینوں محکمے سکریٹری برائے امور دفاع کے سپرد کردیے گئے تاکہ وہ انھیں زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔

سنہ ۱۹۴۸ء کا صدارتی الیکشن[1] بھی آپہنچا۔ ری پبلکنوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ سولہ سال کے بعد انھیں صدارتی انتخاب میں کامیابی ہوگی کیونکہ مہنگائی سے تنگ آکر ملک نظام حکومت بدلنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس ڈیموکریٹک دور میں انکم ٹیکس بھی کم ہوگیا تھا اور تجارت بھی سنبھل گئی تھی لیکن مہنگائی کے سبب اوسط درجے کے لوگوں کے لئے اپنی آمدنی میں سے کچھ بچانا مشکل تھا۔

خوشحالی، مہنگائی اور ٹیکسوں کی بھرمار کا بیک وقت موجود ہونا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو یوں سمجھئے کہ حکومت یورپ

---

[1] سنہ ۱۹۴۶ء میں کانگریس کا الیکشن ہوا تھا صدارت کا نہیں۔ مترجم

میں کمیونزم کے فوجی اقدام کی پیش بندی کے لئے "سرد جنگ" پر کثیر رقم خرچ کر رہی تھی لہذا اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکس بڑھا دیئے گئے تھے اور چونکہ تجارت سنبھل چکی تھی اس لئے خوش حالی میں کوئی کلام ہی نہیں تھا۔ باقی رہی مہنگائی سو اس کی وجہ ظاہر ہی ہے۔ اس فوجی اقدام کا خدشہ اس لئے تھا کہ روس نے اپنے سرحدی ملکوں (مثلاً ایران جو تیل کا خزانہ ہے اور ترکی جس پر آسانی سے فوج چڑھائی جا سکتی تھی) کو دھمکانا شروع کر دیا تھا۔ زیکوسلواکیا اگرچہ بڑا پکا جمہوری ملک تھا لیکن چونکہ روس کی سرحد سے ملا ہوا تھا اس لئے روس نے وہاں کمیونسٹ حکومت قائم کرا کے اسے بھی آہنی پردے کے پیچھے گھسیٹ لیا۔ اسی طرح یونان میں کمیونسٹوں اور سرکاری فوجوں میں خوب تصادم ہوا اور اسی قسم کی خانہ جنگی کی دھمکیاں اٹلی اور فرانس کو بھی دی گئیں۔ برلن سے مغربی طاقتوں کا پتہ کاٹنے کے لئے مغرب کے تمام ذرائع آمدورفت بمعہ ریلوں کے بند کر دیئے لیکن برطانیہ اور امریکہ نے روسی ہوائی جہازوں میں رسد اور سامان کے بحری جہازوں میں سامان کی بجائے فوج جرمنی میں پہنچانے سے روک دیا۔ ان تمام مخالفانہ کارروائیوں کا راز یہی تھا کہ روس نے ایٹمی ہتھیار جمع کر لئے تھے۔

امریکہ جس طرح جنگ میں اپنے دوستوں کی مدد کر رہا تھا اسی طرح کمیونسٹ سیلاب کو روکنے میں بھی ان کا مددگار تھا۔ یہ پالیسی صدر ٹرومین

نے واضح کردی تھی اور اسی کی بنا پر یونان کو فوجی اور اقتصادی امداد دی جارہی تھی۔ اس پر اعتراض بھی ہوا لیکن ٹرومین نے جواب دے دیا کہ جب تک فریق ثانی (روس) کی پالیسی نہیں بدلے گی امریکہ کو یہ تمام اقدامات کرنے ہی پڑیں گے۔ یورپ کی اقتصادی بدحالی کا مقابلہ کرنے کے لئے جارج مارشل (سکریٹری برائے امور مملکت) نے ایک تجویز مارشل پلان کے نام سے ۱۹۴۷ء میں پیش کی۔ اس پلان کا مقصد کسی ملک کی مخالفت نہیں بلکہ افلاس، بھوک اور مصیبت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کو یورپ کی بحالی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سکریٹری مارشل نے واضح کیا تھا کہ یورپ کی صنعت، تجارت اور زراعت کو جنگ سے بھاری نقصان پہنچا ہے اور یہ حالات اگر جاری رہے تو کمیونزم کے لئے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے اس براعظم کو دوبارہ اعتدال پر لانے کے لئے ٹھوس امداد کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے بمعہ روس کے تمام یوروپین ممالک کو دعوت دی کہ وہ مل کر بیٹھیں اور ایک خاکہ تیار کریں کہ وہ اپنی حالت سدھارنے کے لئے خود کیا کر سکتے ہیں اور انھیں بیرونی امداد کی کس قدر ضرورت ہے تاکہ امریکہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سامان اور سرمایہ قرضہ دے۔ سٹالن نے اس مارشل پلان کو غیر جمہوری قرار دیا۔ اور نہ صرف خود شامل ہوا بلکہ اپنے زیر اثر ممالک کو بھی منع کر دیا۔ بہرحال سولہ ممالک کے نمائندے بمعہ مغربی جرمنی کے اس تجویز کے مطابق پیرس میں جمع ہوئے اور امریکہ کے اس سترہ ارب کے پلان پر غور

کر کے اپنی اپنی بحالی کا پروگرام بنایا۔ ایک امریکی پال فیمین کی رہنمائی میں یہ پلان عام طور پر کامیاب رہا اور مغربی یورپ کے ممالک میں جن کی اقتصادیات کو جنگ نے زیرو زبر کر دیا تھا۔ امریکہ کے ساتھ مل کر اپنی حالت کو بہتر بنایا اور اقتصادی بدحالی کو دور کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ممالک میں کمیونسٹ پارٹیوں کا زور گھٹتا چلا گیا۔

دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے امریکہ مغربی یورپ کے ایک فوجی دفاعی معاہدے میں بھی شامل ہوا۔ اس معاہدے کو نارتھ اٹیلانٹک ٹریٹی کہا جاتا ہے۔ یہ متحد ہونے کی تحریک یورپ کی تھی جس میں امریکہ نے سرگرم حصہ لیا اور اس معاہدے میں ۱۲ ملکوں نے بمعہ برطانیہ، فرانس، اٹلی، کناڈا، یونان اور ترکی نے یہ طے کیا کہ اگر ان میں سے کسی ایک ملک پر بھی حملہ ہوا تو وہ سب اس کی مدد کریں گے۔ اس معاہدہ کا پہلا سربراہ جنرل آئزن ہاورہے اور یہ نیٹو (نارتھ اٹیلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) کے نام سے مشہور ہے۔ اور ۱۹۴۹ء میں مکمل ہوا تھا۔ اس کا فوجی صدر مقام پیرس رکھا گیا۔ اس طرح متحدہ اقوام کے دو فوجی بلاک بن گئے۔ ایک آزاد قوموں کا اور دوسرا روس اور اس کے حامیوں کا۔

امریکیوں نے صدر ٹرومین کی خارجہ پالیسی کو بہت سراہا۔ عوام کا یہ رویہ دیکھ کر ۱۹۴۸ء کے صدارتی انتخاب میں ری پبلکنوں نے صدر ٹرومین کی ہی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کا اعلان کیا اور تھامس

ڈیوی کو ری پبلکن پارٹی کی طرف سے کھڑا کیا۔ یہ وہی ڈیوی تھا جو ۱۹۴۴ء میں روز ولٹ کے مقابلہ میں ہار گیا تھا۔

ڈیموکریٹوں کو اس مرتبہ اپنے جیتنے کے امکانات زیادہ روشن نظر آ رہے تھے کیونکہ صدر ٹرومین کے ری پبلکن حکومت سے داخلی معاملات پر کچھ اختلافات چل رہے تھے اور درآمد کی زیادتی پر ٹرومین سے ہر طبقۂ خیال کے ڈیموکریٹ ناراض تھے۔ ڈیموکریٹوں کے دائیں بازو کے لوگ زیادہ تر جنوبی ریاستوں میں تھے جو صدر ٹرومین سے اس لئے اختلاف رکھتے تھے کہ اُس نے حبشیوں (سابقہ غلاموں) کے حقوق کی حفاظت کے لئے کوشش کی تھی۔ بائیں بازو کا لیڈر ہینری والس تھا جو روز ولٹ کے دور میں نائب صدر بھی رہ چکا تھا اس کی پالیسی روس سے مفاہمت کرنے کی تھی۔ والس ٹرومین کا سکریٹری برائے تجارت تھا۔ لیکن چونکہ اس نے ایک پبلک جلسے میں صدر کی پالیسی سے اختلاف کر کے اپنی پالیسی کا اعلان کیا تھا اس لئے اس کو کابینہ سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اور ۱۹۴۸ء میں اس نے ڈیموکریٹوں سے بھی علیحدہ ہو کر ایک نئی ترقی پسند پارٹی بنا لی تھی۔ جس کو امریکہ کے کمیونسٹوں کی حمایت حاصل تھی اس کے باوجود بھی عدد جنوب کو ہموار رکھ سکتا تھا۔ لیکن اُس نے شہری حقوق کے پروگرام پر زور دیا جس کا مقصد ذات پات کے اختلافات کو دور کرنا تھا۔ اس وجہ سے جنوب بھی صدر ٹرومین کا حامی نہ تھا دوسری وجہ یہ تھی

کہ اُس نے پول ٹیکس (رائے دہندگی کا ٹیکس) ختم کرنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے جنوب کے بہت سے غریب حبشی اور سفید فام لوگ ووٹ دینے سے رہ جاتے تھے۔ صدر کی یہ کوشش اگرچہ نہایت مناسب تھی لیکن جنوب کے مفاد کے منافی تھی اس لئے اس کا اثر الٹا مرتب ہونا لازمی تھا۔

جب صدر ٹرومین اپنی شہری حقوق کے پروگرام پر مضبوطی سے جما رہا تو اس کا ردعمل یہ ہوا کہ جنوبیوں نے ریاستی حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا اور جے تھرمنڈ کو صدارت کے لئے اپنا نمائندہ نامزد کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس صدارتی انتخاب کے لئے چار نمائندے میدان میں آ گئے یعنی ڈیوی، ٹرومین، تھرمنڈ اور والیس اور جب پولنگ شروع ہوا تو عام خیال یہ تھا کہ ری پبلکنوں کی فتح یقینی ہے کیونکہ مخالفین کے ووٹ کئی حصوں میں بٹ جائیں گے۔

ڈیوی تو اختلافی مسائل میں کوئی دلچسپی لے ہی نہیں رہا تھا۔ البتہ ٹرومین سارے ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ کسانوں کو مزید امداد کا یقین دلا رہا تھا اور مزید سماجی سہولتیں اور تحفظات کے وعدے کر رہا تھا۔ الغرض عوام کے نمائندے جب صدر کا انتخاب کرنے بیٹھے تو ٹرومین کو ۳۰۲ ووٹ ملے۔ ڈیوی کو ۱۸۹ تھرمنڈ کو صرف ۳۹ اور والیس کے حق میں ایک ووٹ بھی نہ آیا۔ آخر کانگریس کے دونوں ایوانوں میں ڈیمو کریٹک پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

دوسری صدارت کی ابتدائی تقریر میں صدر ٹرومین نے دوسری خارجہ پالیسی کا اعلان کیا جو دنیا میں امن کے بقا کے سلسلے میں چہار نکات کہلاتے ہیں۔ ان چار نکات کو بتاتے ہوئے اس نے کہا "یہ ٹھوس پروگرام ہے اور ہم سائنس اور صنعت کے فوائد سے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے کام کریں گے اور ٹیکنیکل امداد کے پروگرام میں امریکہ کو اُمید ہے کہ وہ دنیا کا معیار زندگی بلند کرنے میں بنجر زمین کو کام میں لائے گا قدرتی وسائل کو ترقی دے گا اور مفید کاموں میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔" اس کے باوجود بھی جب ٹرومین نے صدارت سنبھالی تو عوام کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھے چنانچہ انھوں نے ٹرومین کے نظامِ حکومت پر الزامات عائد کئے۔ سینٹ کے ایک ممبر جوزف میکارتھی (ری پبلکن) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محکمہ امور مملکت جس کا سکریٹری ڈین ایچیسن تھا کمیونسٹوں اور ان کے ایجنٹوں کا ایک چھتہ ہے۔ اور یہ تو عام خیال تھا کہ اکثر سرکاری حکام دوسری جنگِ عظیم میں کمیونسٹ رہے ہیں۔ محکمہ امور مملکت کے ایلگرہس کے مقدمہ نے اس خیال کو اور بھی تقویت دی تھی کہ وسیع پیمانے پر جاسوسی ہو رہی ہے۔

سرد جنگ برابر جاری تھی۔ کانگریس نے کمیونسٹ پارٹی اور اس سے متعلق تمام جماعتوں پر نگاہ رکھنے کے لئے ایک نیا قدم اُٹھایا کہ اس قسم کی پارٹیاں اپنے آپ کو گورنمنٹ سے رجسٹرڈ کرائیں اور اپنے کاموں کی رپورٹ دیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ۱۹۴۹ء میں دس کمیونسٹ

لیڈر پکڑے گئے اور جب ان پر مقدمہ چلایا گیا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش ثابت ہو گئی لہٰذا انھیں قید کر دیا گیا اب مقامی طور پر خود افراد اور جماعتیں اس کی کھوج میں رہنے لگیں کہ کمیونسٹوں کا ہمدرد کون ہے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے اس کا بھی اظہار کیا کہ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ جستجو سے انفرادی آزادی میں فرق آتا ہے حالانکہ انفرادی آزادی امریکہ کا بُنیادی اصول ہے لیکن برخلاف اس کے اکثریت اس کی حامی تھی کہ امریکہ کو بہر حال اپنے آپ کو بچانا ہی چاہیئے۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ ہمارے انصاف کا قانون یقیناً کمیونسٹوں سے بہتر ہے اس لئے کسی بے گناہ کے پھنسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرضیکہ ملک میں ایک طرف تو کمیونزم کے متعلق یہ نئے نئے سوالات اُٹھ رہے تھے دوسری طرف کمیونسٹ برابر لاقانیت کے لئے کوشاں تھے اور ابھی یہ مسئلہ کسی مناسب حل تک نہیں پہنچا تھا کہ کوریا کی آزادی پر ایک انوکھے ڈھنگ سے حملہ کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ایشیا میں کچھ عجیب اُلجھے ہوئے اور اشتعال انگیز حالات چل رہے تھے۔ امریکہ نے چند سال تک ان کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے لئے چھوڑ دیا کہ پہلے حالات اور واقعات پر اچھی طرح عبور حاصل کر لیا جائے۔

فلپائن کو آزادی دینے کا جو وعدہ امریکہ نے کیا تھا وہ ۴ جولائی

۱۹۴۶ء کو انھیں مکمل آزادی دے کر پورا کردیا۔ اس کے بدلے میں وہاں کی نوزائیدہ جمہوریت نے اپنی اقتصادی امداد کے لئے اپنے فوجی اڈے امریکہ کو دے دیئے۔ ادھر جنرل میک آرتھر کو جنگ کے بعد جاپان کا فوجی گورنر بنا دیا گیا تھا۔ اس نے جاپانی قوم میں کئی باتیں جمہوری حکومت کی رائج کیں۔ اگرچہ شہنشاہ ہیرو ہتیو ہی کو رکھا لیکن ایک نیا دستور بنوا دیا جس کی رو سے جاپان کے مرد اور عورتوں نے ایک قانون ساز جماعت منتخب کی۔ ۱۹۵۱ء میں روس کے احتجاج پر وہ ملک جو اس سے لڑے تھے انھوں نے اس کے ساتھ معاہدہ صلح کی تکمیل کی جس کے نتیجے میں جاپان کے پاس صرف اپنا ہی ملک رہ گیا اور باقی تمام علاقے اس کے قبضے سے نکل گئے۔ یہ صلح نامہ جان فوسٹر ڈلس کا تیار کیا ہوا تھا جو امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا خاص نمایندہ تھا اور اس پر جاپان نے پوری طرح مطمئن ہو کر دستخط کئے تھے۔ آگے چل کر جاپان نے بھی اپنے فوجی اڈے امریکہ کو دیدیئے تاکہ بحرالکاہل کا دفاع مضبوط کیا جائے۔ البتہ چین میں امریکی پالیسی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ دورانِ جنگ میں امریکہ نے کوشش کی تھی کہ چینی حکومت کے سربراہ چیانگ کائی شیک اور چینی کمیونسٹ لیڈروں میں مفاہمت کرادی جائے کیونکہ کمیونسٹ چینی حکومت سے بہت بڑے علاقے پر گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور اس وقت یہ اندرونی لڑائی بہت خطرناک تھی کیونکہ دنیا پہلے ہی جنگ کے

لپیٹ میں آئی ہوئی تھی ۔ امریکہ کا اس مفاہمت سے یہ مقصد تھا کہ ان دونوں کو متحد کر دیا جائے تاکہ یہ جاپان کا مقابلہ کر سکیں ۔ لیکن یہ کوشش ناکام ہوگئی ۔ چیانگ کائی شیک کا کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا ۔

روس کا حالانکہ چیانگ کائی شیک کے ساتھ دوستی کا معاہدہ تھا لیکن جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد بجائے چیانگ کی مدد کرنے کے، روس نے کمیونسٹوں کو مدد دینی شروع کر دی ۔ مدد ملتے ہی انھوں نے قوم پرستوں (چیانگ کے حامیوں) پر حملے تیز کر دیئے ۔ بہت سے امریکیوں کا اس سلسلے میں یہ خیال تھا کہ چیانگ کی حکومت کی بدعنوانیاں ہی اس مصیبت کا باعث ہیں اس لئے اس کی مدد نہ کی جائے لیکن زیادہ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ بدعنوانیوں کے باوجود چیانگ کو خوب مدد دی جائے تاکہ کمیونسٹوں کا جھگڑا ہی نمٹ جائے ۔ مگر کمیونسٹوں نے جب زمینوں کی اصلاحات کا وعدہ کیا تو چینی عوام کی خاصی تعداد ان کی حمایت کرنے لگی ۔ اس طرح جب چین میں صورت حال نازک ہوتی چلی گئی تو امریکہ کی حکومت سمجھ گئی کہ فوجی اور مالی امداد اب چیانگ کی حکومت کو نہیں بچا سکتی جب کہ خود عوام ہی چیانگ کے ساتھ نہیں ہیں لہٰذا امداد کا خیال چھوڑ دیا گیا ۔ جب حالات بالکل ہی بگڑ گئے تو آخر چیانگ اپنی بچی کھچی فوج لے کر فارموسا چلا گیا گویا کمیونسٹوں کو ملک پر قبضہ کرنے کی کھلی چھٹی دیدی ۔

دوسری جنگِ عظیم کے بالکل آخری دنوں میں جب روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو روسی سپاہیوں نے جاپان کے مقبوضہ کوریا پر حملہ کر دیا تھا اور انھیں ۳۸ عرض البلد تک دھکیل دیا تھا۔ اس وقت امریکہ اور روس میں یہ سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ امریکی فوجیں جاپانیوں کو ۳۸ عرض البلد کے جنوب میں شکست دے دیں اور روسی اس کے شمال میں اور یہ اس سے بھی پہلے طے ہو چکا تھا کہ جنگ کے بعد کوریا کو مکمل آزادی دے دی جائے گی۔ لیکن روس اس جزیرہ نما کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا اور شمالی کوریا کو کمیونزم کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ امریکہ نے اس دھاندلی کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کر دیا اور جنرل اسمبلی نے یہ فیصلہ دیا کہ تمام کوریا میں الیکشن کرا کر کوریا میں ایک آزاد حکومت قائم کر دی جائے مگر شمالی کوریا کے روسی افسران نے اپنے شمالی علاقوں میں الیکشن کرانے سے انکار کر دیا چنانچہ صرف جنوبی کوریا میں الیکشن کرایا گیا سنگمین ری اس نئی جمہوریت کا صدر منتخب ہوا اور اقوام متحدہ نے اس حکومت کو سارے کوریا کی حکومت مان کر تسلیم کر لیا۔ حکومت قائم کرانے کے بعد امریکی فوجیں کوریا سے واپس آگئیں۔

جنوبی کوریا کو دیکھا دیکھی روسی افسران نے وہاں ایک کٹھ پتلی "عوامی جمہوری" حکومت بنا دی اور ایک فوج تیار کر کے مسلح کر دیا اس کے بعد وہاں سے اپنی فوجوں کی کافی تعداد واپس بلا لی۔ مختصر یہ کہ ۲۵ جون سنہ ۱۹۵۰ء کو شمالی کوریا نے پوری طاقت سے جنوبی کوریا

پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ اقوام متحدہ نے بھی اس پر فوری کارروائی کی۔ اور روسی نمایندے کے بغیر ہی سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرلیا کیونکہ روس کے نمایندے نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کردیا تھا — بائیکاٹ کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ روس کی نیت بخیر نہ تھی اور روسی نمایندے کے دل میں چور تھا وہ کس منہ سے سیکورٹی کونسل میں آکر بیٹھتا اقوام متحدہ کے تمام ممبران اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کمیونسٹوں کی یہ کامیابی ان کے لئے ایشیا میں پھیلنے کا راستہ صاف کردے گی اور چونکہ فرانسیسی انڈوچائنا میں پہلے ہی کمیونسٹ خانہ جنگی میں مصروف ہیں اس لئے ان کا دوسرا قدم اس طرف بڑھنا لازمی ہے لہذا متفقہ طور پر یہ قرار پایا کہ جوابی حملہ کرکے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس نازک موقع پر صدر ٹرومین نے بڑی حوصلہ مندی سے اقوام متحدہ کے فیصلہ کے مطابق عمل کیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ امریکہ کی فوجیں جنوبی کوریا کے دفاع میں مدد دیں گی اور ساتویں بیڑے کو حکم دے دیا کہ وہ فارموسا اور کمیونسٹ چین کے درمیان رہے تاکہ یہ جنگ اس علاقے میں نہ پھیلنے پائے اور کوریا ہی تک محدود رہے۔ کوریا میں امریکی فوجوں کی کمان کرنے کے لئے جنرل میک آرتھر جیسے آزمودہ کار کمانڈر کو منتخب کیا گیا۔ جاپان سے امریکی دستے کوریا کی طرف بڑھے اقوام متحدہ کے دوسرے ممبر ممالک نے بھی اپنے اپنے دستے اور رسد بھیجنی شروع کردی۔ جنگ کے پہلے ہلہ میں شمالی کوریا والوں نے اقوام متحدہ کی فوجوں کو کوریا کے تقریباً باہر تک دھکیل دیا اور سیول پر قبضہ کرلیا۔

اتحادی فوجیں بس پوسان پر ٹکی رہ گئیں۔ لیکن ستمبر ۱۹۵۰ء میں جنرل میک آرتھر نے جوابی حملہ کیا اور انچون پر فوجیں اُتار کے دشمن کو بدحواس کر دیا ۔ سیول پر دوبارہ قبضہ کر کے شمالی کوریا میں دور تک بڑھتا چلا گیا اور اس کے ہراول دستے دریائے یالو یعنی منچوریا کی سرحد تک پہنچ گئے۔ یہاں چینی کمیونسٹوں کے رضا کاروں نے اچانک حملہ کر کے اتحادی فوجوں کو پھر جنوبی حدود میں دھکیل دیا۔ لیکن روس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے اس حملے کے لئے کوئی ہدایت نہیں کی تھی مگر دُنیا جانتی ہے کہ یہ اسی کے اشارے پر ہوا تھا ۔ بہت کافی پیچھے ہٹنے کے بعد اتحادی فوجیں پھر بڑھیں اور اس مرتبہ بڑی سخت جنگ ہوئی ۔ شمالی کوریا اور چینی افواج کو زبردست نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ چینی افواج کی شمولیت نے اتحادیوں کے سامنے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ اتحادی فوج جس کا حل سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی ۔ جنرل میک آرتھر کا خیال ہوا کہ منچوریا اور دوسرے ہوائی اڈوں پر اتنی زبردست بمباری کرے کہ ہوش ٹھکانے آجائیں اور فارموسا سے چیانگ کی فوجیں اپنے ساتھ ملا کر پوری طرح مزا چکھا دے لیکن امریکہ کی حکومت نے اس کو اس پر عمل کرنے سے روک دیا ۔ اگرچہ خیال نہایت معقول تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کے ممبروں کو ڈر تھا کہ ایسا کرنا تیسری عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گا ۔
جب جنرل نے اپنی تجویز پر اصرار کیا اور پبلک میں اپنا نظریہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ایسے بیانات دیئے جو اقوام متحدہ کی پالیسی کے خلاف

جاتے تھے تو صدر ٹرومین نے اسے برطرف کردیا۔ جنرل مجبور ہو کر امریکہ لوٹ گیا۔ سخت مخالف لیکن با عزت بن کر۔

جون ۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ میں روسی نمایندے نے کوریا میں جنگ بندی کی تجویز پیش کی جس پر تمام ممبر فوراً راضی ہو گئے اور کائے سنگ میں جنگ بندی کی بات چیت شروع ہوئی لیکن جنگ بندی کی حدود اور اور جنگی قیدیوں کے مسئلے پر پھر معاملہ اٹک گیا۔ کمیونسٹ چاہتے تھے کہ شمالی کوریا کے تمام جنگی قیدی واپس کر دیئے جائیں حالانکہ ان میں بہت سے ایسے تھے جو واپس جانے کے لئے تیار نہیں تھے اور جنوبی کوریا کی حکومت کو شمالی کوریا سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے لہذا یہ بھی اچھا خاصا معمہ بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ بندی کی بات چیت لمبی ہوتی چلی گئی اور ڈھائی لاکھ امریکی جوان اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے لڑتے رہے اور اپنی جانیں قربان کرتے رہے۔

جس طرح امریکیوں نے یوروپ کے معاملے میں صدر ٹرومین کی خارجہ پالیسی کی حمایت کی تھی اسی طرح کمیونزم کو ایشیا میں روک دینے کی تائید کی لیکن کوریا کی جنگ میں مرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی، قومی قرضے کی مقدار زیادہ سے زیادہ چڑھتی نظر آئی اور بغیر کسی بڑی جنگ کو دعوت دیئے کوریا کے فتح کرنے کا سوال سامنے آیا تو عوام کا صدر پر اعتقاد کم ہوتا چلا گیا اور حکومت کی اندرونی بدعنوانیوں نے اس عدم اعتماد کو اور بھی سہارا دیا۔ عوام کو معلوم ہو گیا کہ اندرونی محاصل کے دفتر

کے حکام ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے والوں سے رشوتیں لے کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور اسی قسم کی بدعنوانیاں ری کنسٹرکشن فائننس کارپوریشن میں موجود تھیں۔ وہاں کے حکام قرض لینے کے خواہشمندوں سے کمیشن اور مٹھائی وصول کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ محکمہ عدلیہ پر بھی یہ الزام تھا کہ انھوں نے ووٹنگ کے سلسلے میں دھوکہ دہی کی مناسب تحقیقات اور چھان بین نہیں کی۔ ان شکایتوں کی وجہ سے دستور میں بیسویں ترمیم لائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ آیندہ کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ صدارت نہیں کرسکتا یا اگر کوئی پہلے دو سال تک صدارت پر فائز رہ چکا ہو تو وہ مزید ایک مرتبہ سے زیادہ صدارت نہیں کرسکتا لیکن اس شرط سے اس صدر کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جو اس شرط کے پاس ہونے کے وقت صدارت کر رہا ہو (یعنی صدر ٹرومین) لیکن اس ترمیم کے پس پردہ جو جذبہ کام کر رہا تھا ٹرومین اس کو بھانپ گیا لہذا اس نے خود ہی اعلان کردیا کہ وہ اس کے بعد صدارت کا امیدوار نہیں ہوگا۔

۱۹۵۲ء کے الیکشن کا سلسلہ ایک سال پہلے ہی شروع ہوگیا تھا جب ٹافٹ نے اعلان کیا تھا کہ وہ ری پبلکن پارٹی کے نمایندے کی حیثیت سے صدارت کے انتخاب میں کھڑا ہوگا اگرچہ وہ باریک بیں اور سخت مزاج کا انسان تھا اور حکومت کی خرابیاں دور کرنے کے لئے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت بھی تھی لیکن عوام میں وہ ہردلعزیز نہیں تھا اور جو لوگ اسے جانتے بھی تھے

وہ اس کی امریکہ کو دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی سے متفق نہیں تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ہی قابل سیاستدان تھا اور ری پبلکن پارٹی کے پورے نظام کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور مناسب امیدوار کی تلاش میں بین اقوامی ری پبلکنوں کی ایک جماعت کیبٹ لاج کی قیادت میں نیٹو کے صدر مقام پیرس جنرل آئزن ہاور کے پاس پہنچی کہ اس کے سیاسی خیالات معلوم کرے۔ آئیزن ہاور قوم کا چوٹی کا ہیرو شمار کیا جاتا تھا لیکن اس نے اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی پارٹی سے اپنا تعلق ظاہر کیا تھا۔ اس لئے ہر پارٹی اسے اپنا ہم خیال سمجھتی تھی اور اسی وجہ سے ۱۹۴۸ء کے صدارتی انتخاب کے موقع پر ڈیموکریٹ بھی اس کے پاس پہنچے تھے کہ وہ اسے ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ پر صدارت کے لئے کھڑا کردیں مگر لاج اور اُس کے ساتھیوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ آئیزن ہاور خیالات کے اعتبار سے ری پبلکن ہی نکلا۔ اور اُس نے یہ وعدہ کرلیا کہ اگر عوام اسے پسند کرتے ہیں تو وہ صدارت کے انتخاب کے لئے ری پبلکن ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لئے تیار ہے اور جب اسے یقین دلایا گیا کہ ری پبلکن پارٹی اسے اپنا نمائندہ ضرور نامزد کرے گی تو اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور الیکشن میں حصّہ لینے کے لئے امریکہ چلا آیا۔

ٹافٹ اور اُس کے حامیوں نے بڑی کوشش کی کہ رائے عامہ آئیزن ہاور کے خلاف ہو جائے لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور آئیزن ہاور کو صدارت کے لئے اور سینٹ کے ایک ممبر رچرڈ نکسن کو نائب صدارت کے لئے ری پبلکن پارٹی کی طرف سے نامزد کر دیا گیا۔ اسی الیکشن میں اور بھی کئی امیدوار تھے مثلاً کیفو ور جو جرائم کی تحقیقات کرنے میں ملک گیر شہرت کا مالک تھا۔ البن برکلے جو نائب صدر بھی تھا۔ سینٹ کا ممبر رچرڈ رسل اور ہیری مین لیکن صدر ٹرومین کو ان سب سے زیادہ سٹیونسن پسند تھا۔ وہ اگرچہ سیاست میں نو وارد تھا مگر اس کی شہرت اس کی گورنری کے زمانے ہی سے اچھی تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کے ڈیموکریٹک پارٹی میں آجانے سے پارٹی کی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ پارٹی نے اسے مجبور کر دیا ورنہ صدارت کے لئے اس کی اپنی کوئی خواہش نہیں تھی۔

سنہ ۱۹۵۲ء کے صدارتی الیکشن کی یہ خصوصیت تھی کہ جتنے اُمیدوار تھے ان میں سے کسی کو بھی کوئی زیادہ سیاسی تجربہ نہ تھا حتیٰ کہ جنرل آئیزن ہاور بھی سیاست داں نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ تو فوجی آدمی تھا اور چکنی چپڑی باتیں کرنا نہیں جانتا تھا۔ سیدھی سادھی اور صاف صاف بات کہتا تھا۔ مگر مخالفین بڑی بڑی جوشیلی، عمدہ اور دانشمندانہ تقریریں کرتے تھے اور اندرونی اور بیرونی مسائل

پر تبصرہ کرتے تھے۔

غرضیکہ مساویانہ برتاؤ، حکومت کی بدعنوانیوں اور کوریا کے مسائل پر الیکشن لڑا گیا۔ آئیزن ہاور آخری دو مسائل پر تو روشنی ڈال سکتا تھا۔ کوریا کے مسئلے کی وہ اس لئے تشریح کر سکتا تھا کہ خود فوجی تھا اور فوجی معاملات کو اچھی طرح سمجھتا تھا اسی لئے اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ منتخب ہو گیا تو وہاں جاکر حالات کا خود معائنہ کرے گا۔ مساویانہ سلوک کے بارے میں اُس نے صرف اتنا کہا کہ چھوٹے طبقے کے لوگوں کو ڈیموکریٹک پالیسی سے سماجی اور معاشی فائدے پہنچے ہیں اس لئے وہ اس پالیسی کو جاری رکھے گا اور اس میں دفتری ہیر پھیر کو دخل نہ دینے دے گا۔ سیٹونسن بلاشبہ خود بہت دیانتدار تھا مگر وہ حکومت کی خرابیوں پر اس لئے زبان نہیں کھول سکتا تھا کہ وہ صدر ٹرومین کا منظور نظر تھا اور صدر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اگر وہ حکومت کی خرابیوں کا تذکرہ کرتا تو صدر ٹرومین کو ناراض کر لیتا۔ البتہ مساویانہ سلوک کے متعلق اس نے وعدہ کیا کہ وہ روزولٹ اور ٹرومین کے نقش قدم پر چلے گا۔

ڈیموکریٹک کا مداح جنوب خاموشی اور دلچسپی سے اس جدوجہد کو دیکھ رہا تھا۔ دفتری حکومت اور حد سے زیادہ مرکزیت کے خلاف آئیزن ہاور کے خیالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ریاستوں کے

حقوق کا حامی ہے اور یہ بات جنوب کے مطلب کی تھی۔ اس کے علاوہ لوگ اسے جنگ کا ہیرو بھی سمجھتے تھے۔ آئزن ہاور کی تقریریں سُن سُن کر جنوب کے باشندے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ری پبلکن پارٹی ڈیموکریٹوں سے بھی زیادہ جیفرسن اور کالہاؤن کے اصولوں کی پابند ہو جائے۔ جنوب کو سب سے زیادہ دلچسپی سمندر کے کنارے پائے جانے والے تیل سے تھی۔ ٹکساس لوسینیا، اور فلورڈا کے ساحلوں کے پاس تیل کے بڑے بڑے ذخیرے موجود تھے جن سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا اس تیل کی مالیت کا اندازہ چالیس ارب سے ڈھائی کھرب تک کیا جاتا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ ذخیرے ان ریاستوں کی ملکیت ہیں جن کی سرحد لگتی ہے یا مرکزی حکومت ان کی مالک ہے۔ یہ قصہ کافی پُرانا تھا اور اس سلسلے میں تین موقعوں پر سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ مگر آئزن ہاور نے یہ کہہ کر جنوب کی رائے اپنے حق میں ہموار کر لی کہ تیل کی زمین ان ریاستوں کی حدود میں شامل کر دینی چاہیئے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ تین تین میل کا ٹکڑا کیلی فورنیا اور لوسینیا کے پاس آتا تھا اور تقریباً ساڑھے دس دس میل کا علاقہ ٹکساس اور فلورڈا کو ملتا تھا۔ سیٹونسن کی رائے یہ تھی کہ یہ تیل کے خزانے مرکزی حکومت کے ہیں اور تمام امریکیوں کی مشترک ملکیت ہیں لیکن متعلقہ ریاستوں کو اس تیل کے

منافع کا کچھ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

الیکشن والے دن کے اعداد و شمار اپنے سامنے رکھ کر سیاسی مبصرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ الیکشن آئیزن ہاور اور سیٹونسن دونوں کا اچھا رہا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کون کامیاب ہوگا لیکن صرف چوبیس گھنٹے بعد ہی وہ پھر سر جوڑے بیٹھے تھے اور ہارنے والے کے الیکشن کی کوتاہیوں اور غلطیوں پر غور کر رہے تھے کیونکہ کامیابی آئیزن ہاور کو نصیب ہوئی تھی۔ انتخاب کرنے والے نمایندوں میں سے ۴۴۲ آئیزن ہاور کے حق میں گئے تھے اور ۸۹ سیٹونسن کے۔ اور اگر پبلک ووٹنگ کا شمار کیا جائے تو تین کروڑ چالیس لاکھ ووٹ آئیزن ہاور کو ملے اور دو کروڑ ستر لاکھ سیٹونسن کو۔ جنوب کی ریاستیں (ورجینا، ٹینس سی، ٹکساس اور فلورڈا) ری پبلکنوں کے ساتھ گئی تھیں اور اگرچہ سیٹونسن کافی کامیاب رہا تھا لیکن امریکی عوام طے کر چکے تھے کہ بیس سالہ ڈیموکریٹک حکومت دیکھ چکے۔ اب سیاسی نظام بدلنا ہی چاہیے۔

۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو صدر آئزن ہاور کیپٹول (واشنگٹن) میں امریکہ کے چونتیسویں صدر کی حیثیت سے داخل ہوا۔ وہ کھلی طبیعت کا مسکراتا ہوا آدمی تھا مگر جب اُس نے قوم سے خطاب کیا جسے دنیا سُن رہی تھی تو سنجیدہ اور محتاط نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا

"میرے ساتھیو۔ دنیا اور ہم نصف صدی سے یہ چیلنج سنتے آئے ہیں اور ہمیں اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس کا احساس ہے کہ نیک اور بد طاقتیں جمع ہیں، مسلح ہیں اور مخالفت پر ایسی کمربستہ ہیں کہ تاریخ میں ایسی مثالیں کم ملیں گی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی عقل و ضمیر کے مطابق کام کریں اور محنت سے کریں جو کچھ سکھائیں رغبت کے ساتھ سکھائیں اور جو کچھ کہیں پورے یقین کے ساتھ کہیں اپنے ہر کام کو احتیاط اور انصاف سے تولیں اور پرکھیں ان سب چیزوں کے لئے ضروری ہے کہ صداقت ہم پر منکشف ہو۔ امریکہ جو کچھ خود پا کر دنیا کو دینا چاہتا ہے وہ پہلے اس کے اپنے دل میں اترنا چاہئے"